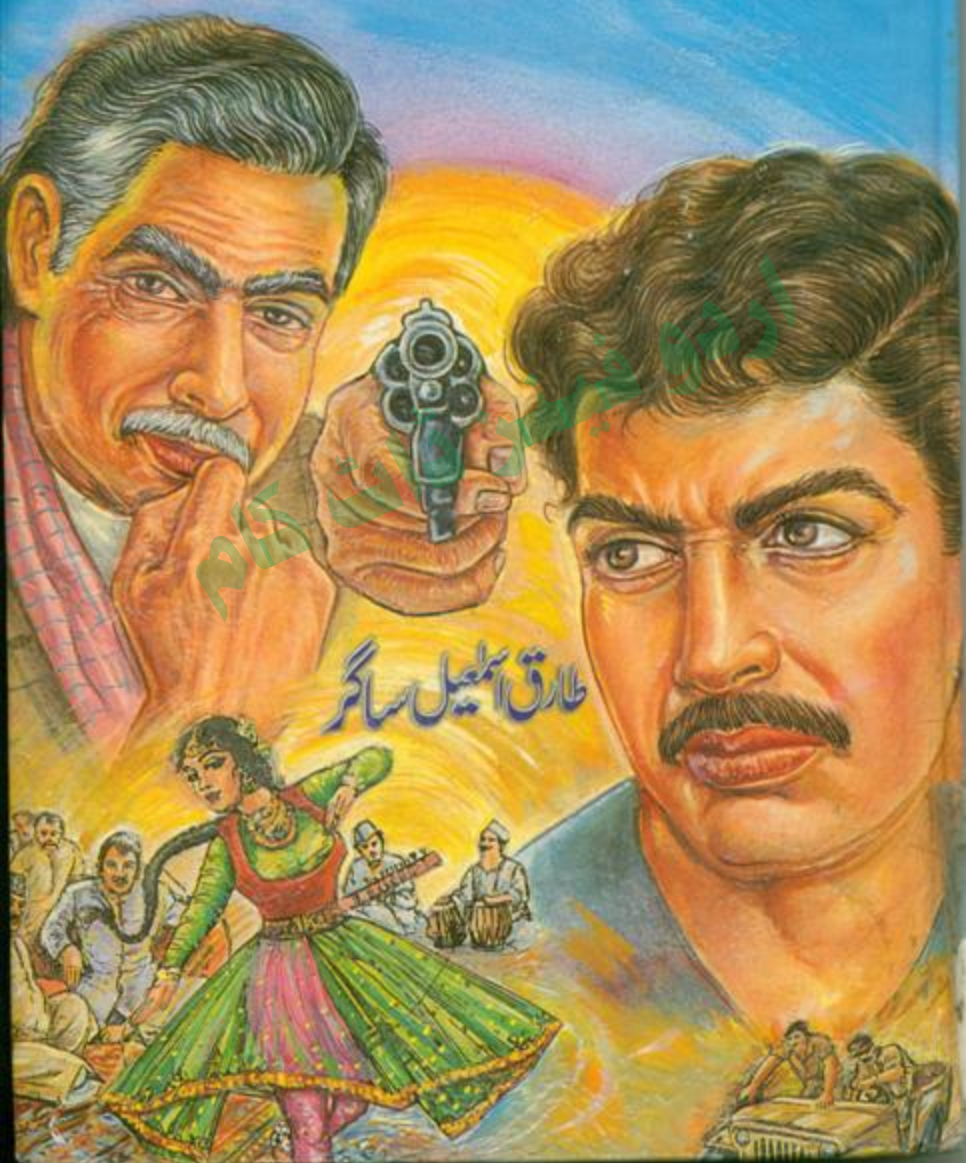


جنتی ہوارا ہی



بھنگا پڑا راجہ

طارق اسماعیل ساگر

اردو سینٹر ڈاٹ کام

ساگر پبلشرز

برائے کوثر مال - داتا دربار روڈ - لاہور

www.sagar.com

فہرست

5	عرض مصنف
9	فکراؤ
20	سراب
30	جال
41	شکار اور شکاری
53	سیاست اور.....
64	فریب نگری
78	شطنج کے مہرے
95	ہتھ ٹھوکا
108	قربانی کے بکرے
119	انٹیلی جنس
136	آستین کے سانپ
157	گھناؤ نے کھیل

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: بھٹکا ہواراہی
مصنف: طارق اسماعیل ساگر
ناشر: ساگر پبلشرز، 7۔ اے لوئر مال، داتا دربار روڈ، لاہور
فون:- 7230423
کمپیوٹر کوڈ: 1S98
قیمت: 200/- روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953 فیکس:- 042-7238010

9۔ انکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:- 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

عرض مصنف

یہ کتاب جو آپ پڑھنے جارہے ہیں ذرا مختلف ذائقہ رکھتی ہے۔
آپ نے آج تک میری جن کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ان میں ایمان داری اور اپنی بساط
بھر کوشش سے میں نے پاکستان کے دشمنوں کو بے نقاب کیا ہے۔
میں نے کوشش کی ہے کہ تصویر کا وہ رخ آپ کو دکھاؤں جس کو دیکھنا ہم پسند نہیں
کرتے۔

یہ جاننے کے باوجود کہ.....
تلخ حقائق کے سامنے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے ہم بلی کے خطرے کو نہیں ٹال
سکتے۔

”بھٹکا ہوا راہی“ میرے اس مشن کا حصہ ہے.....!
یہ آستین کے ان سانپوں کی کہانی ہے جو مادر وطن کو ڈنک لگانے سے کبھی نہیں چوکتے۔
یہ ان خون پینے والی جوکوں کا قصہ ہے جو روپ بدل بدل کر سامنے آتیں اور ملت کے
جسد خاکی سے خون چوس کر اپنی پیاس بجھا رہی ہیں۔

ان خونی درندوں کے جو بظاہر بڑے معزز انسانوں کے روپ میں ہمارے سامنے
موجود ہیں، کئی نام ہیں۔

181	دوستی کے نام پر
195	بھولا پنچھی
213	سانپ کے منہ میں چھپکلی
224	صیاد اپنے دام میں
236	انکشاف
251	نہلے پہ دہلا
265	آتش فشاں
276	دوسرا روپ
311	سازش اور ٹکراؤ
344	فاتح
362	حملہ
375	پارٹ آف گیم
389	زمین اور ماں

کئی حوالے ہیں.....!

کئی شناختیں ہیں.....!

ان کے آج تک سلامت رہ جانے کا راز بھی شاید یہی ہے کہ انہوں نے خود کو کبھی ایک روپ تک محدود نہیں رکھا.....

وقت کے ساتھ ساتھ یہ خون آشام، بھیڑیے اپنے چہروں پر نقاب بدلتے رہتے ہیں۔ تاکہ..... ان کی شناخت ممکن نہ رہے۔

50 سال سے یہ خونخوار درندے پاکستان کے غیور اور سادہ لوح عوام کی رگوں سے لہو نچوڑ رہے ہیں۔

گھن کی طرح انہوں نے ہماری ملی اقدار و روایات کو چاٹ لیا ہے۔

اب جب کہ ان کے کالے کرتوتوں کے سبب ہم اپنا آدھا ملک گنوا چکے ہیں تو بھی ان کالی دیوی کے پجاریوں کی پیاس نہیں بجھی۔

اور.....!

یہ نفرت، تعصب، منافقت اور ریاکاری کے گھناؤنے حربے سے مسلح ہو کر ایک مرتبہ پھر اپنی تمام تر شیطانی قوتوں کے ساتھ پاکستان کی سلامتی پر حملہ آور ہوئے ہیں۔

بھائی کو بھائی سے لڑا کر، گھناؤنے نعروں کی آڑ میں پاکستانیوں کو آپس میں ٹکرا کر یہ وحشی اپنی سیاست کی دکان چکا رہے ہیں۔

انہوں نے آج اس عظیم ملک کو جو اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام پر معرض وجود میں آیا تھا، اقوام عالم کی نظروں میں ایک عام سالک بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

وہ عظیم قوم جس نے اپنے لہو کے دریا میں تیر کر پاکستان کی منزل پائی تھی۔ آج ان انسان نماد رندوں کے ہاتھوں بے بس ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔

لیکن.....!

یہ نہیں جانتے کہ بظاہر جو دکھائی دے رہا ہے وہ سارا سچ نہیں ہے۔ گو کہ ان کی شیطان کاریوں کے ہاتھوں آج باغیرت پاکستانیوں کو دم گھٹا محسوس ہو رہا ہے۔

لیکن.....!

ایک لاوا اندر ہی اندر دھک رہا ہے۔

اور جس روز یہ لاوا پھٹے گا.....

ان سب شیطانوں کو جو اپنی دانست میں زمین پر خدا بنے بیٹھے ہیں، اس طرح بہا کر لے جائے گا۔

جیسے تیز آندھی راکھ کو اڑالے جاتی ہے.....

مکافات عمل سے بے بہرہ یہ ملک دشمن نہیں جانتے کہ پاکستان خدا کے بابرکت نام پر معرض وجود میں آیا تھا۔ اس کی جڑوں میں لاکھوں ماؤں، بہنوں، بچوں، بزرگوں اور نوجوانوں کا خون ٹھانھیں مار رہا ہے.....

اس کی ہریالی کو رہتی دنیا تک شہیدوں کا خون قائم رکھے گا.....

اور.....

اس کے دشمن اس مملکت خدا داد کا برا چاہنے والے ایک روز اس طرح نیست و نابود ہو جائیں گے کہ پھر شاید ان کی داستان تک بھی داستانوں میں باقی نہیں رہے گی۔

طارق اسماعیل ساگر

ٹکراؤ

ٹرین نیویارک کے ”پن سٹیشن“ میں داخل ہو رہی تھی۔

ایک مرتبہ پھر اپنے کوٹ کی جیب تھپتھا کر اس نے اندر کی جیب میں پلاسٹک کے چھوٹے سے پیکٹ کی موجودگی کا احساس کیا اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رین کوٹ جو اس نے سلیقے سے تہہ کر اپنے سر کے اوپر سامان کے لئے مخصوص جگہ پر رکھا تھا، اب اٹھا کر پہننے کی تیاری کرنے لگا۔ موسم کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ جلد رکنے والی پھوار نہیں ہے۔

سٹیشن سے باہر اس کا استقبال برفیلی ہوا کے تھپڑوں نے کیا۔ ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے گہرا سانس لیا، جیسے ہوا میں موجود ساری ٹھنڈک کو اپنے پیچھے مڑوں میں اتار لینا چاہتا

ہو۔

گرم ہال کمرے کے باہر لوگ قطار بنا کر ٹیکسیوں میں سوار ہو رہے تھے لیکن وہ پیدل ہی اپنے سامنے والی سڑک عبور کر گیا۔ دائیں ہاتھ پہلا موڑ مڑ کر اب وہ ”براڈوے“ پر آ گیا تھا۔

اپنے دونوں ہاتھ اس نے کوٹ کی لمبی جیبوں میں ٹھونسنے ہوئے تھے۔ کوٹ کے کالر کھڑے کئے اور سر پر فلیٹ ہیٹ جمائے وہ بظاہر برفباری سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ سڑک کے

مائیکل شاید پہلے ہی کہیں قریب موجود رہا تھا اور اس اطمینان کے بعد کہ وہ ”محفوظ“ ہے اس نے ارسلان کے نزدیک پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع دی تھی.....!

”کمرہ نمبر 20 میں چلے جاؤ.....!“ مائیکل نے اسے کہا اور واپس مڑ گیا۔

اس نے مقامی کالوں کی طرح ایک چمکداری جیکٹ پہن رکھی تھی اور سر کے بال لیس وار سلوشن سے گوندھ کر سلیقے سے سر پر جمار کھے تھے۔ گردن پر جمی میل گوکہ اس کے کالے رنگ کا حصہ بن چکی تھی لیکن الگ سے نظر آ رہی تھی اور اس کی جیکٹ کے کالر پر جم گئی تھی۔

اپنارین کوٹ اتار کر اس نے بازو پر لٹکایا اور ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

استقبالیہ میں موجود لڑکی نے مسکراتے ہوئے اُسے خوش آمدید کہا لیکن ارسلان اس کی طرف دیکھ بغیر لفٹ کی طرف چل دیا۔

اگلے ہی لمحے وہ لفٹ پر سوار دوسری منزل کی طرف جا رہا تھا۔ 20 نمبر کمرے کے سامنے رک کر اس نے طویل راہداری پر نظریں جمائیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی یہاں موجود نہیں تھا۔

دروازے پر آہستہ دستک دے کر اس نے اندر موجود شخص کو اپنی آمد سے مطلع کیا۔

”دیس.....! اس کی دستک کے جواب میں ایک بھاری بھر کم آواز بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں ایک لمبا تڑنگا گندی رنگ کا آدمی صوفے پر ٹانگ پارے بیٹھا تھا۔

”ہوں ہوں.....!“ اس نے ارسلان کی ”ہیلو“ کا جواب یک غراہٹ نما مسکراہٹ سے دیا۔

”مجھانے یہ کبخت موسم کب سنھلے گا.....؟“ اس نے اپنی دانست میں ماحول بدلنے کو بات کا آغاز کیا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اسے گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔

”سامان لائے ہو؟“ اس کی بات کا سامان موجود شخص نے ذرا سا بھی نوٹس نہیں لیا

تھا۔

ارسلان کو قدرے باپوسی ہوئی لیکن اس نے اندازہ کر لیا کہ اس کی توقع کے برعکس یہ

کنارے کاروں کی لمبی قطاریں گرین سگنل کی منتظر تھیں۔ کاروں کی چھتوں پر سفید برف کے گالے جمے تھے اور ونڈ سکرینوں پر واپرا پنی پوری رفتار سے چل رہے تھے۔ قریباً سب ہی کاروں کی ونڈ سکرینوں کے کونوں پر برف جمی تھی۔

زندگی اس کے قدموں کی رفتار کے ساتھ ساتھ ریگ رہی تھی۔ سڑک کنارے بنی دکانوں کے چھجوں تلے امریکن کالے اور گورے شراب کی بوتلیں ہاتھوں میں تھامے جھوم رہے تھے۔

ہڈیوں میں سرایت کرتی اس سردی میں وہ اکیلا ہی پیدل نہیں چل رہا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

”پیارے.....!“ اس نے زیر لب ان پر تبصرہ کیا۔

کھر کی چادر نے اپنے دامن میں سڑک سے آسمان تک کو سمیٹ لیا تھا لیکن وہ آنکھیں بند کر کے بھی ”پنٹا ہوٹل“ تک پہنچ سکتا تھا۔

فاصلہ تھا ہی کتنا.....؟

بمشکل دو فر لاگ.....!

○

معمول کے مطابق وہ چلتا ہوا ہوٹل کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے کے باہر ہوٹل کے مستعد ملازمین ہر آنے والے گاہک کا سامان لپک لپک کر تھام رہے تھے۔ ہوٹل کے شیڈ کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر اس نے اپنے کالر پر جمی برف کو جھاڑا پھر یہی عمل دونوں کندھوں پر دہرایا اور اب اپنے بازو پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھنے کے لئے وہ رین کوٹ..... کی آستین ہٹا رہا تھا۔

اچانک ہی مائیکل اس کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔

بالکل ایسے جیسے مصیبت بن بتائے اور بن بلائے اچانک کسی کے سر پر پہنچ جائے۔

اس کے لئے اب اس ”اچانک“ کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ اسے زندگی میں

اچانک بہت سے عجیب و غریب حالات سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔

جتنی حادثاتی زندگی اس نے گزاری تھی اس کا گمان کسی دوسرے کے بس میں نہیں تھا۔

فحش پاکستان یا بھارت کا باشندہ نہیں اور اس نے اپنی کھال کا رنگ بھی مصنوعی طریقے سے تبدیل کیا ہوا تھا۔

”لیس سرا“ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پلاسٹک کی ایک تھیلی نکال کر سامنے میز پر رکھ دی۔

اندر موجود فحش نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ لمبا کر کے وہ تھیلی اٹھائی اور اس پر لپٹا کاغذ الگ کر کے تھیلی میں موجود سفید پاؤں کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تھیلی دیکھتے ہی ایک پراسرار چمک جاگ اٹھی تھی۔

اپنے منہ کے قریب لا کر اس نے تھیلی کو سونگھا اور اپنے دائیں ہاتھ رکھے بریف کیس میں منتقل کر دیا۔ اس بریف کیس سے ڈالروں کا ایک بنڈل نکال کر اس نے ارسلان کی طرف پھینک دیا تھا۔

ارسلان نے سامنے کی میز پر جھک کر بنڈل اٹھایا، دیکھے اور گئے بغیر جیب میں رکھ لیا۔ ابھی وہ بمشکل سیدھا ہی ہو پایا تھا کہ اچانک ہاتھ روم کا دروازہ کھلا اور ایک قریباً غنگی عورت جس نے اپنے سر پر تولیہ پیٹ رکھا تھا، باہر نکل آئی۔

”ہائے.....!“ اس نے ارسلان پر نظر پڑتے ہی امریکی لہجے میں سلام کیا۔

”ہائے.....!“ ارسلان نے اس کی طرف دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

اس کی موجودگی نے اس حرافہ کی صحت پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا اور وہ بدستور اسی حالت میں چلتی اس کی آنکھوں کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر اپنے سر پر موجود تولیہ کھولنے لگی تھی۔

”مجھے اجازت ہے؟“ ارسلان نے دریافت کیا۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، کافی نہیں پیو گے؟“

”میں نیچے ہال میں پی لوں گا۔ شکریہ!“ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اپنے تعاقب میں اس نے حرافہ کا ہتھکڑن لیا تھا، شاید اس کی حالت پر ہنس رہی تھی بے

جاری!

یا شاید اس کی بے بسی پر قہقہہ لگایا تھا اس نے!

اس مرتبہ لفٹ سے اتر کر وہ باہر جانے کی بجائے ڈائننگ ہال کی طرف چل دیا تھا۔

ڈائننگ ہال قریباً بھرا ہوا تھا۔ ایک کونے کی میز پر ایک عورت شیشے کی دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔

○

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرا ہوا اس میز کی طرف گیا۔ میز کے نزدیک موجود بینگر پر اس نے اپنا رین کوٹ لٹکایا اور کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

عورت نے ابھی منہ دیوار کی طرف کیا ہوا تھا۔ شاید سامنے کسی اجنبی کی موجودگی کے احساس نے اس کو ادھر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔

مسکراتے ہوئے اس نے گردن موڑی اور اپنے سامنے موجود فحش کو دیکھ کر اچانک اسے سکتہ ہو گیا۔

کچھ یہی کیفیت ارسلان پر بھی گزری تھی۔

”ارسلان تم.....!“ عورت کے منہ سے بمشکل نکلا۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان دو الفاظ کی ادائیگی کے لئے اسے بے پناہ قوت صرف کرنی پڑی ہے۔

حیرت اور دکھ ایک ساتھ کی آنکھوں اور چہرے پر جم گئے تھے۔

”ہما.....!“ ارسلان نے بھی بڑی ہمت سے اس کا نام لیا تھا۔

دونوں شاید اس حادثے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے، جب اچانک ہی ویٹرس نے دو مینو بڑے احترام سے ان کے سامنے رکھ دیئے۔

○

دونوں کو جیسے ایک دم سے بھولی ہوئی کہانی یاد آ گئی تھی۔

لیکن یہ کہانی بھولی ہوئی کب تھی.....!

کم از کم ارسلان نے کبھی اس کہانی کو نہیں بھلایا تھا۔

پانچ سال پہلے جب وہ یونیورسٹی میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات ہما سے ہی ہوئی تھی۔ ہما اس سے ایک سال سینئر تھی اور دونوں ایم اے انگلش کر رہے تھے۔

”ہیلو.....!“ اس نے ایک طلبہ تنظیم کا سینکر اپنے بائیں کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔

ارسلان کے لئے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس نے دوپٹہ نہیں اوڑھ رکھا تھا اور جس بے باکی سے اس نے ارسلان کو مخاطب کیا تھا اس کا تصور بھی پاکستانی سوسائٹی میں محال تھا۔

”خوش آمدید!“ ہمارے سامنے ایک اور نوجوان بھی اس کے قریب آ کر مخاطب ہوا۔۔۔۔۔!

”شکریہ!“ ارسلان نے کہا۔۔۔۔۔ ”مجھے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی طرف جانا ہے۔“

”آئیے میں آپ کو لے چلوں۔“ ہمارے آگے بڑھ کر کہا۔

”چلے۔۔۔۔۔!“ ارسلان جھجکتا ہوا اس کے تعاقب میں چل دیا۔

اچانک ہی اسے عابد نظر آ گیا تھا۔

عابد اس کے گاؤں کا رہنے والا اور یہاں سال دوم کا طالب علم تھا۔ ارسلان پر نظر پڑتے ہی وہ سیدھا سی کی طرف آیا تھا۔

”کدھر منہ اٹھائے جا رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ اس نے ارسلان کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”کدھر نہیں، میرے ساتھ جا رہے ہیں ڈیپارٹمنٹ کی طرف۔۔۔۔۔!“ اس کے بجائے ہمارے عابد سے کہا تھا۔

”دیکھئے مس ہمارے یہ کوئی تنظیمی جھگڑا نہیں۔ یہ میرے گاؤں کا ساتھی ہے اور یہاں پر صرف تعلیم حاصل کرنے آیا ہے۔ اسے کسی گندی سیاست میں ملوث نہیں ہونا۔“ عابد کا تعلق شاید اس کی مخالف تنظیم سے تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا ہم یہاں گندی سیاست کر رہے ہیں؟ تم خود کو کیا سمجھتے ہو؟ یہ معصوم سی شکل بنا کر تم کسی کو دھوکہ دینا چاہتے ہو۔۔۔۔۔؟“

”میں آپ کے منہ لگنا پسند نہیں کرتا۔ یوں بھی مجھے کسی عورت سے بحث کرنا زیب نہیں دیتا۔ آپ برائے مہربانی میرے ساتھ نہ الجھئے۔“

یہ کہتے ہوئے عابد نے اس کا بازو تھام لیا اور کچے کچے ارسلان کو قریب کھینچتا ہوا اپنے ساتھ دوسری طرف لے گیا۔ اس کے تعاقب میں ہمارا لیکچر جاری تھا لیکن عابد نے اس کی طرف دوبارہ دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔

خیریت گزری کہ وہ یونیورسٹی کے دروازے پر ان جھسے میں کھڑے تھے ورنہ ابھی یہاں طلباء تنظیمیں آپس میں ٹکرا جاتیں۔

”کون ہے یہ؟“ کینٹین میں پہنچ کر ارسلان نے پہلا سوال کیا۔

”ہمارا کبیر شیروانی۔ ایک بڑی ہوئی ریکس زادی! باپ علاقے کا سب سے بڑا زمیندار ہے۔ تمام بھائی اعلیٰ سرکاری ملازمتیں کر رہے ہیں۔ احق کہیں کی! نوکروں کی فوج کے ساتھ فلیٹ کرائے پر لے کر رہتی ہے اور یہاں انقلاب کا پرچار کرتی ہے۔ ذہنی مریض ہے کجخت۔ خیر چھوڑو! تم بتاؤ ادھر گاؤں میں تو خیریت ہے نا؟“

نجانے کیوں ہمارا کبیر شیروانی کا تعارف اس طرح کر دانا ارسلان کو اچھا نہ لگا۔ ٹھیک ہے اس کا تعلق عابد کی مخالف طلباء تنظیم سے تھا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ ایک لڑکی کے متعلق خواہ مخواہ ایسی رائے قائم کرے۔

ارسلان کو خواہ مخواہ ہمارے ہمدردی ہونے لگی تھی۔۔۔۔۔ لیکن وہ عابد کو کچھ کہہ نہ سکا۔ عابد اس کے بڑے بھائی کا دوست تھا اور گاؤں کے نمبردار کا بیٹا۔ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ اس کے والد سرکاری افسر تھے لیکن انہوں نے کبھی یہاں سے الگ ہونا پسند نہ کیا۔ زمین سے آمدن ہو جاتی تھی اس لئے ارسلان کے والد کو کبھی رشوت لینے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

تینوں بہن بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ہوشلوں میں رہتے تھے لیکن ان کی تربیت اس منہ پر ہوئی تھی کہ کسی نے کبھی دیہاتی زندگی پر شہری زندگی کو ترجیح نہیں دی تھی۔ ارسلان کے بڑے بھائی نے اعلیٰ سول سروس کا امتحان دے رکھا تھا اور بہن ایم اے کر رہی تھی۔ وہ خود انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا خواب لے کر یہاں آیا تھا۔

طلباء سیاست اس کے لئے کوئی نئی یا چونکا دینے والی چیز نہیں تھی۔ میٹرک کے بعد سے اسے کالج میں تعلیم سے کم اور طلباء سیاست سے زیادہ سابقہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی مضبوط طلباء تنظیم سے وابستگی کے بغیر کالج سے گھر تک کا راستہ بھی غیر محفوظ ہو سکتا ہے۔

عابد نے اس سے صرف گاؤں کی باتیں کی تھیں۔ دونوں چائے سے فارغ ہو چکے تھے اور اب عابد اسے مطلوبہ دفتر تک چھوڑنے گیا تھا۔ اس نے اپنی موجودگی میں ارسلان کے کاغذات اور فیس وغیرہ کا مرحلہ بھی طے کر دیا تھا۔

رات گئے تک ارسلان شام مصر اور فارس کا شہزادہ اور کبھی گاؤں کا لکڑہارا بنتا رہا۔ خوبصورت شہزادی اور پریوں کی ملکہ اس کے ہاتھ کئی مرتبہ لگی اور چلی گئی۔ اس کی آنکھ تب کھلی جب ہوٹل کی مسجد کا مؤذن جاگنے والوں کو فلاح کی بشارت دے رہا تھا۔

لیکن فلاح کی راہ پر چلتے چلتے جیسے اچانک ہی کسی پگڈنڈی نے کوئی موٹر مڑا لیا ہو۔ جیسے کوئی شارٹ کٹ اپناتے ہوئے اصل راستے سے بھٹک جائے۔ بالکل ایسے ہی وہ بھی اپنی راہ چلتے چلتے زندگی کی پٹری سے اچانک اتر کر کسی طرف لڑھک گیا تھا۔

○

جب وہ بیدار ہوا تو دھوپ روشن دان سے اس کے منہ پر آ گئی تھی۔ سردیوں کی اس صبح کو سورج کی کوئل کرنوں نے بڑی ملائمت اور نرمی سے بالکل ہما اکبر شیروانی کی طرح اسے خوش آمدید کہا تھا۔ سرہانے رکھی گھڑی پر آنکھیں ملتے ہوئے اس نے نظر ڈالی تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔

”میں آٹھ بجے تک سوتا رہا.....؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ اسے اپنے آپ پر پہلے تو غصہ پھر ترس آنے لگا تھا۔ تو لہ اٹھا کر اس نے غسل خانے کا رخ کیا اور جب تیار ہو کر باہر نکلا تو ناشتے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ کبھی چائے کا عادی نہیں رہا تھا لیکن نجانے آج کیوں وہ شدت سے چائے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔

ذہن منتشر تھا۔

اور وہ خود تھکا تھکا سا یونیورسٹی کی طرف جا رہا تھا۔

ہوٹل سے یونیورسٹی کینٹین کا فاصلہ بمشکل پندرہ منٹ کا تھا لیکن آدھ گھنٹے میں وہ وہاں پہنچا۔

کینٹین میں نوجوان طلباء اور طالبات مستقبل میں اپنی زندگیوں پر ٹوٹنے والے قہر سے لائق چائے اور کوک کی بوتلوں سے منہ لگائے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ان کی ہر حرکت زندگی کی علامت تھی۔

جیسے وہ مکمل زندگی کے ساتھ جینے کا عزم لئے بیٹھے ہوں۔

○

ارسلان نے یونیورسٹی میں داخلے کے فوراً ہی بعد ایک ہوٹل میں کمرہ حاصل کر لیا تھا اور یہاں سے فارغ ہو کر وہ اپنے ہوٹل کے کمرے کی طرف ہی جا رہا تھا۔

اسے رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے خواہ مخواہ ہمارا جیسی خوبصورت لڑکی کا موڈ خراب ہوا۔ کاش عابد وہاں نہ آیا ہوتا اس نے سوچا۔ ہوٹل پہنچ کر وہ اپنے بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ ہمارا کبر شیروانی اس کے بستر تک اس کے ساتھ چلتی آئی تھی اور اب اس کے ذہن پر براجمان ہوئی بیٹھی تھی۔

شاید اس کے دل کا کوئی دریچہ اچانک ہمارے لئے کھل کر بند ہو گیا تھا اور اب وہ نہ واپس جانے والے لمہانوں کی طرح اس کے دل میں سما گئی تھی..... وہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والا لڑکا نہیں تھا۔

لیکن.....!

جو خواب اس نے اپنی کھلی آنکھوں سے آج یونیورسٹی میں دیکھا تھا اس سے چھٹکارہ کیسے ممکن ہوگا؟ یہی کچھ سوچتا ہوا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ ڈائننگ ہال کی طرف جا رہا تھا۔ کھانے کا وقت ختم ہونے والا تھا جس کے بعد اسے ہوٹل سے کھانا نہ ملتا اور وہ ہوٹل کے باہر جا کر کھانا اسے بہت عجیب لگتا تھا۔

بوجھل قدموں سے اس نے اپنا کھانا وصول کیا اور جیسے تیسے کچھ لقمے زہر مار کر کے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ جس کی دیواروں، زمین، چھت اور بستر سے ہمارا اکبر کے مانوس لہجے کی خوشبو لپٹیں بن کر اس کے دل و دماغ کو معطر کر رہی تھیں۔

”ہیلو..... میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ.....!“

دو فقرے ہی تو اس نے بولے تھے۔

کتنی اپنائیت تھی ان دو فقروں میں! کتنا موہ لینے والا انداز تھا اس کا! کبھی ہمارا گم کردہ شہزادوں کی مدد کرنے والی خوبصورت پری بن جاتی اور کبھی جنات کے شہنشاہ کی قید میں پھنسی اس شہزادی کا روپ دھار لیتی جس کو آزاد کروانے کی سعادت بالآخر گاؤں کے لکڑہارے کو نصیب ہوئی تھی۔

اس کا دل چاہا کہ ہمارا کوہدے اس سے بڑی جادوگرنی اور ہے کہاں.....؟ اس نے تو بنگال کے جادو کو بھی مات دے دی تھی۔ اتنی جلدی تو وہ لوگ بھی آدمی کو گدھا نہیں بناتے جتنی جلدی اس نے ارسلان کے دل میں اپنی محبت کا بھالا اتار دیا تھا۔

”آپ چائے تو پیجئے.....!“ اس نے ارسلان کے سامنے رکھی ٹھنڈی چائے کی طرف اشارہ کیا..... ”لیکن آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہوگئی۔“

اتنا کہہ کر اس نے ویٹر کو اشارہ کر کے وہ چائے اٹھانے اور نئی چائے کے ساتھ کچھ لانے کی ہدایت کر دی۔

قریباً آدھا گھنٹہ وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ اب ارسلان خود میں اتنی ہمت پارہا تھا کہ اس کی باتوں کا کم از کم ”ہوں ہاں“ میں ہی جواب دیتا رہے۔

”اب ہمیں چلنا چاہئے کہیں پھر نہ آپ کے گاؤں کے دوست آجائیں اور آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر برا منائیں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ارسلان نے بیوقوفوں کی طرح مسکراتے ہوئے دانت نکال دیئے۔

کاؤنٹر پر جب ارسلان نے بل ادا کرنا چاہا تو کینٹین والے نے بل وصول کرنے سے انکار کر دیا۔

”مس صاحبہ کے مہمانوں سے ہم بل وصول نہیں کر سکتے جناب!!“ اس نے سعادت مندی سے ہمارا کی طرف دیکھ کر گردن جھکالی۔

”یہ تو زیادتی ہے۔“ ارسلان نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ کبھی آپ یہ زیادتی کر لیجئے حساب برابر۔“ اس نے ہنستے ہوئے جب بے تکلفی سے ارسلان کے کندھے پر ہاتھ مارا تو اس کا سارا بدن جھنجھنا اٹھا۔

دونوں اکٹھے ہی ڈیپارٹمنٹ کی طرف جارہے تھے۔



ایک خالی کونے میں بیٹھ کر اس نے چائے منگوائی اور ابھی چائے کا کپ اس کے ہونٹوں سے بمشکل چھو رہی تھا جب اچانک اپنے بغلی دروازے سے اس نے ہمارا کبر شیروانی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے دروازے میں رک کر ایک سرسری نظر ماحول پر ڈالی۔

دو چار شناسا چہروں نے ہوس ناک آنکھوں سے اس کو ”ہیلو ہیلو“ کہا اور فقیروں کی طرح اس کی قربت کی بھیک مانگنے کے لئے اسے مدعو کرنے لگے۔

لیکن..... ہمارا ان سب سے لائق اپنے ہونٹوں پر نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ لئے سیدھی اسی کی میز کی طرف آئی۔

کسی نادیدہ قوت نے ارسلان کی ٹانگوں میں بجلیاں بھر کر اسے کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا۔

”ہیلو.....!!“ اس نے حسب عادت ارسلان کی طرف ڈس لینے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکراہٹ اچھالی۔

جواب میں وہ بمشکل ”ہیلو“ ہی کہہ سکا تھا۔

”کیسے ہیں آپ؟ کام ٹھیک ہو گیا تھا ناں.....؟“ اس نے کل والے واقعے پر بڑی ہمت سے معذرت کرنا چاہی۔

”ارے نہیں بھئی! آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ معافی تو مجھے مانگنی چاہئے۔ میری وجہ سے ہی ساری تلخی ہوئی۔“ اس نے ارسلان کی بات کاٹ کر اس کے دل کو کاٹ کھایا۔

”لیکن آپ کی.....!“

”کوئی بات نہیں۔ میں سمجھتی ہوں انسان کو اپنے نظریات کی خاطر اتنی سی قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔ اگر آپ سچائی کے راستے پر چلیں گے تو بہت کم لوگوں کو اپنا ہم خیال پائیں گے۔

مجھے عابد صاحب سے کوئی گلہ نہیں۔ صرف اتنی بات کہوں گی کہ وہ اگر اپنے نظریات میں مخلص ہیں تو دوسروں سے خوفزدہ کیوں ہیں؟ محض اس بات سے ڈر جانا کہ میں آپ کو ڈیپارٹمنٹ تک لے جاؤں گی..... بہت عجیب لگتا ہے۔ بھئی میں کوئی جادوگرنی تو نہیں ہوں کہ آپ پر جادو کر کے آپ کو انسان سے کچھ اور بنا دیتی.....“ اتنا کہہ کر اس نے بے تکلفی کے انداز میں قہقہہ لگایا تو ارسلان بھی مسکرایا۔

سراب

دن ہفتوں اور مہینوں میں بدلتے گئے۔
وقت کا پتہ بھی ارسلان کو اپنے پروں پر بٹھائے ہوا کے رخ پر اڑائے چلا جا رہا تھا اور
ارسلان بے لگام گھوڑے کی طرح بھاگتا چلا جا رہا تھا۔
عابد یونیورسٹی میں اپنی تنظیم کا ناظم تھا۔ ایک بھائی کے ناطے اس نے متعدد درجہ چاہا کہ
اس بے لگام گھوڑے کو لگام دے لے اس کو روک دے۔ اس سے پہلے کہ بھاگتے بھاگتے اس کی
ٹانگوں سے زندگی کا رس نچر جائے۔ اس سے پہلے کہ اس کے بدن کی ساری توانائیاں اس کی تمام
ذہانتیں رنگ آلود ہو جائیں اسے قابو کر لے لیکن یہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔
جیسے ارسلان کے بس میں کچھ نہیں رہا تھا۔

ہاں اس شہر میں اپنی بڑی کوشی کی انیکسی میں رہتی تھی۔ اس کے والدین دوسرے شہر میں
تھے۔ ہما کا گھر اس کی پارٹی کا ہیڈ آفس نظر آتا تھا۔ یہاں پارٹی سے منسلک نوجوانوں کا آنا جانا لگا
رہتا تھا۔

ہمانے کسی کو ایک حد سے تجاوز نہیں کرنے دیا تھا۔ ارسلان محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے
علاوہ وہ کسی کے ساتھ اتنی ”فری“ نہیں ہوتی۔ کسی سے اتنی باتیں نہیں کرتی۔ کسی کو منہ نہیں لگاتی۔

ایک وہی تھا جس سے تنہائی میں گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کو سمجھاتی کہ اس ملک
کے عوام کی قسمت تب ہی بدل سکتی ہے جب یہاں انقلاب آئے گا۔ ہمارے مسائل کا حل
انتخابات نہیں، انقلاب ہے۔

وہ حیران تھا کہ اتنے رئیس ماں باپ کی بیٹی، سونے کا چچہ لے کر پیدا ہونے والی ہما اکبر
شیروانی غریبوں کی کتنی خیر خواہ ہے۔ اس کی محبت میں اب عقیدت کا رنگ بھی جھلکنے لگا تھا۔
عجیب بات تھی کہ آج تک کھل کر وہ اس کے سامنے اظہار محبت نہ کر سکا تھا۔ اس کا دل
چاہتا تھا، کبھی ہم سیاست سے ہٹ کر بھی بات کریں۔
لیکن.....!

ہما کو تو معاشرے کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ بے انصافیاں، ظلم، رشوت، کرپشن سارے
روگ جو غریب عوام کو لگے تھے اس نے اپنی جان کو لگا رکھے تھے۔
وہ دونوں راتوں کو جاگ کر بیٹھ کر لکھا کرتے۔ ہما اکبر شیروانی صدارت کی امیدوار تھی۔
اس کے مقابلے میں دوسری تنظیم نے عابد کو کھڑا کیا تھا۔

عابد سے اس کے کئی مضبوط حوالے اور رشتے تھے لیکن وہ ہما کے لئے پاگل ہوا جا رہا
تھا۔ اس روز جب اچانک عابد اس کے کمرے میں آیا تو وہ گھبرا ہی گیا۔

”گھبراؤ نہیں“ عابد نے تسلی دی۔ ”تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ میرے تمہارے
ساتھ کئی رشتے ہیں۔ خون سے زیادہ مضبوط رشتے..... اور یہ بھی جان لو کہ اگر تمہارا ایک دوٹ
ہمارے حق میں کاسٹ نہ ہوا تو بھی ہمارے والے نہیں جیت تو ہماری ہوگی۔ میں تو تمہیں صرف یہ
سمجھانے آیا ہوں کہ تم سراب کے تعاقب میں اندھے ہو جاؤ گے۔ تم میرے نزدیک بچے ہو۔
چھوٹے بھائی کی طرح۔ میں تمہیں آخری مرتبہ سمجھا رہا ہوں کہ محبت اور ہوس کو گڈنڈ نہ کرو۔ تم ہما
سے عشق کرتے ہو۔ گدھے! بے وقوف! تم نے ایک سال میں کچھ نہیں دیکھا۔ تمہاری آنکھیں بند
ہو گئی ہیں یا تم نے ان پر ہوس کی پٹی باندھ لی ہے۔ دیکھو ارسلان! وہ ہما سے تم جانتے ہو ہما ایک
پراسرار پرندہ ہے جس کے سر پر بیٹھ جائے اسے بادشاہت تو مل جاتی ہے لیکن ہما نہیں ملتا..... وہ
اپنی آگ میں جل کر مر جاتا ہے اور اس کی راکھ سے ایک اور ہما بھی جنم لیتا ہے۔

یہ روایت تم پر حقیقت بن رہی ہے۔ یہ بڑی تہہ دار لڑکی ہے۔ اس نے اپنے انقلابی

پھر جیسے خود ہی اس نے خود کو تسلی دی وہ اس سے اگر کوئی گناہ بھی سرزد ہو گیا ہے تو اندھے جذبات کے ہاتھوں.....

اور ان جذبات پر اس کا قابو نہیں ہے۔ وہ جب تک اس کا اظہار نہیں کرے گا یہ منہ زور آندھی اسے کمزور پتے کی طرح اپنے ساتھ ساتھ لئے اڑاتی پھرے گی۔ وہ سنہل کر بیٹھ گیا۔ آج اس نے اپنے دل میں مضبوطی سے ایک عہد باندھا تھا اور اب اس عہد کو پورا کرنا تھا۔ ہما کی واپسی چائے کی ٹرائی کے ساتھ ہوئی۔ اس کے چہرے پر خلاف توقع آج کچھ اور ہی کیفیت دکھائی دے رہی تھی۔ ارسلان کو آج اس کا چہرہ پہلے سے بہت معصوم دکھائی دے رہا تھا۔

○

”سوری! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔“ اس نے چائے بناتے ہوئے ارسلان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہا! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے.....! اس نے ہما کی آنکھوں میں تیرے سرخ ڈوروں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اچھا کمال ہے بھئی۔ اب کیا مجھے کہنے کے لئے تمہیں اجازت بھی لینی پڑے گی۔“ اس نے بڑے جبر سے اپنے لہجے کی شوخی کو لوٹایا تھا۔

”دراصل یہ بات مجھے پہلے ہی روز تم سے کہہ دینا چاہئے تھی لیکن میں بزدل ہوں یا پھر مجھ میں کبھی اتنا حوصلہ ہی نہ آیا کہ اتنی بڑی بات کہہ سکوں۔“

”ارسلان! بہت تمہید باندھ لی۔ اب کہہ بھی ڈالو۔ ایسی کیا خاص بات ہے؟“ بظاہر وہ ارسلان کے جذبات سے بالکل لا تعلق نظر آ رہی تھی۔

”ہا! مجھے کہنا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور آج تک میں نے تمہارے لئے جو کچھ بھی کیا ہے وہ صرف تمہارے حوالے سے کیا۔ مجھے کسی انقلاب سے دلچسپی نہیں۔ میں سیدھا سادا دیہاتی لڑکا ہوں۔ بس مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے۔ ایک جنون ہے ایک آگ ہے جس نے اندر ہی اندر جل کر مجھے جھلسانا شروع کر دیا ہے۔ اگر میں نے آج بھی تم پر اظہار نہ کیا تو کسی دن کھوکھلے تنے کی طرح میرے جسم کا درخت گر جائے گا اور میں ختم ہو جاؤں گا۔“

چکر میں جس کو پھانسا وہ نشتے کا مریض ہو گیا۔ تم دیکھو اس کے گھر آنے والے کتنے نوجوان نشتہ کرتے ہیں.....!“

عابد نجانبے کیا کیا کہتا رہا.....!

وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

لیکن.....!

عابد بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی باتیں اس چپکنے گھڑے سے پھسل رہی ہیں۔ ”اچھا بیٹا! اگر تم نے اپنے ماں باپ کی لتیا ڈوبنے کا تہیہ ہی کر لیا ہے تو میں تمہارے لئے صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔ کسی روز تم بہت پیچھتاؤ گے۔“ عابد اسے طعن طعن کر کے واپس چلا گیا۔

○

ارسلان نے بڑھ چڑھ کر ہما کی انتخابی مہم میں حصہ لیا لیکن وہ ہار گئی۔ جس روز الیکشن کے نتائج کا اعلان ہوا تھا دونوں ہما کے گھر اس کے بیڈروم میں بیٹھے تھے۔ فون پر اسے بل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ جب الیکشن کے حتمی نتائج کا اعلان ہوا وہ پھٹ پڑی۔

”میں نہیں مانتی، دھاندلی کی ہے ان لوگوں نے۔ انتظامیہ ان سے ملی ہوئی ہے۔ میں اس پر احتجاج کرتی ہوں.....!“

اور وہ بچوں کی طرح رو دی۔

اسے نے اپنا سر ارسلان کے زانو پر رکھ دیا اور رونے لگی۔ ارسلان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے کیسے تسلی دی۔ اس کے جسم کو چھوتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں کے جل جانے کا دھڑکا لگ گیا تھا۔ اپنے زانو پر رکھے ہما کے سر پر اسے اٹھنے والی خوشبو کی پٹھوں نے اس کے تن بدن میں انگارے بھر دیئے تھے۔ اسے اپنا دم گھٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بدن پر دہشتہ طاری تھا۔

نجانے کس جنونی جذبے کے تحت اس نے ہما کو خود سے چننا لیا۔ ہما کو جب اس کی ”موجودگی“ کا احساس ہوا تو اس نے آہستہ سے خود کو ارسلان سے الگ کر لیا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔ ارسلان کا دل دھک سے رہ گیا۔ ”اف میرے خدا! یہ میں نے کیا کر دیا.....!“ اس کو پیچھتاوا سا لگ گیا تھا۔

وہ خاموش ہو کر ہاکی طرف دیکھنے لگا۔

ہاچپ رہی۔

یہ سنا تا جو اس کی خاموشی نے ماحول پر طاری کر دیا تھا، ارسلان کو ڈسنے لگا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنے فضل پر روئے یا ہنسے۔

”ارسلان.....!“ بالا خرچائے کا گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے ہمارے ہمارے خاموشی کے طلسم کو توڑا..... ”تم بہت اچھے نوجوان ہو، خاندانی لگتے ہو۔ تمہارے والدین نے تم سے بہت سی توقعات وابستہ کی ہوں گی۔ کوئی بھی لڑکی جس سے تم محبت کرو گے، شادی کرو گے، دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوگی۔ میں نے دیکھا ہے دوسرے نوجوانوں کے برعکس تم میں حیا موجود ہے۔ یہی مرد کا زیور ہے..... کاش! تم نے میرے متعلق جو توقعات وابستہ کر لی ہیں ان پر پورا اتر سکتی..... لیکن میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گی۔ میں دھوکہ دے ہی نہیں سکتی۔ میں تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں تمہارے پیار کے لائق نہیں۔ میں نے جو راستہ اپنایا ہے وہ اب نشے کی طرح میری ضرورت بن گیا ہے۔ میں اپنے نظریات سے ہٹ نہیں سکتی کیونکہ میں اس کی بہت قیمت ادا کر چکی ہوں۔ ہاں ارسلان تمہیں بتا دینے میں کوئی عار نہیں سمجھتی کہ میری پاکیزگی کبھی کی خون ہو چکی ہے۔ میں صرف بدن ہوں۔ بدن..... مجھ میں روح نہیں ہے اور بدن بھی ایسا کہ جو تمہارے لائق نہیں۔ میں تمہیں دھوکہ نہیں دینا چاہتی۔ تمہیں کچھ بھی نہیں دے پاؤں گی..... میرا مشورہ یہی ہے کہ تم ابھی اس راستے سے لوٹ جاؤ۔ تمہارا شاندار تعلیمی ریکارڈ ہے۔ تم زندگی میں آگے نکلو ترقی کرؤ مجھے بہت خوشی ہوگی۔“ چہرے لرزے رک کر اس نے کہا۔

”مجھے تم سے محبت ہے۔ تمہاری سادگی، ایمانداری اور حیا سے مجھے بہت محبت ہے۔ میں تمہارے لئے مروتو سکتی ہوں لیکن تمہیں اپنا نہیں سکتی۔“ اپنی بات کے خاتمے پر وہ بچوں کی طرح سک پڑی۔

ارسلان پتھر کا بت بن چکا تھا!

اسے سکتے سا ہو گیا تھا!

○

عابد نے ہمارے سے متعلق روایت کے حوالے سے اسے بتایا تھا کہ ہمارے جس کے سر

پر بیٹھ جائے، اسے بادشاہت عطا ہو جاتی ہے لیکن وہ کسی کو ملتا نہیں! اپنی آگ میں جل کر مر جاتا ہے۔ کوئی اسے پانہیں سکتا، اپنا نہیں سکتا۔ یہی اس کا مقدر.....!

اور یہاں.....!

ہمارے اکبر شیروانی جس کی آنکھوں میں زندگی کے سارے رنگ اگلے لیتے تھے۔ جس کے سانسوں سے زندگی کا ردھم بندھا تھا۔ جو خدا کی اس زمین پر حیات کی علامت تھی۔ اس ہمارے اکبر شیروانی نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے لئے مروتو سکتی ہے اسے اپنا نہیں سکتی.....!

یہ تھا اس کی سال بھر کی تپسیا کا نتیجہ!

اس روز بد کے لئے اس نے اپنی آنکھوں میں نیند حرام کر لی تھی۔

اپنے خاندان کی شرافت کو داؤ پر لگایا تھا۔

حافظ عابد نعیم کو ناراض کیا تھا جو اس کے لئے بڑے بھائی اور باپ کا درجہ رکھتا تھا۔ واقعات کا علم ہونے پر جب والدین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی تو باپ کی طرف دیکھے بغیر نظریں جھکا کر اس سے بات کرنے والے ملک ارسلان کنکریٹ کی مضبوط دیوار کی طرح تن کر باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ آنکھیں ڈال کر کہا تھا کہ وہ اپنے اور ہمارے درمیان کسی وجود کو برداشت نہیں کرے گا۔

اس روز سمرات اکبر اعظم کے سامنے جہانگیر نے بغاوت کر دی۔ وہ ”شیخو“ جس کے لئے اکبر اعظم نے زندگی کو تحج دیا وہی شیخو آج نور الدین جہانگیر بن کر اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا تھا.....!

تاریخ نے اپنے آپ کو یوں ہی دہرایا کرتی ہے.....!

کیا اس دن کے لئے ہوا تھا یہ سب کچھ؟ ارسلان نے اپنے آپ سے پوچھا اور وہ

ٹوٹ کر رہ گیا۔

ایک جھٹکے سے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کوئی معمولی لوٹا نہیں تھا جس کی محبت کو ہمارے اکبر شیروانی نے ٹھکرایا تھا۔

چھ فٹ لمبا اس کا وجود ریت کے گھر وندے کی طرح زمین میں دھنس گیا۔ اس کی

دانست میں مارنے والے اپنا کام مکمل کر چکے تھے لیکن اس کی خوش قسمتی کہ وہ محفوظ رہا.....!
پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں اس کے ذہن پر تھوڑے برسائے لگی تھیں۔
یہ آخری احساس تھا اس کا..... اس کے بعد اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

○

ارسلان کو ہوش آیا تو وہ پیٹوں میں جکڑا ہوا تھا۔
اس کے دائیں ہاتھ والے شینڈ پر خون کی بوتل لٹکی تھی۔ کسی کا خون قطرہ قطرہ بن کر اس
کے جیون کی ٹوٹی ڈور کو سہارا دے رہا تھا۔ جسم کا شاید ہی کوئی ایسا حصہ تھا جس پر چوٹ نہ لگی ہو۔
اس کے بدن کا رواں رواں درد کر رہا تھا۔ کروٹ لینا اس کے اختیار میں ہی نہیں تھا۔ بمشکل اس
نے اپنی گردن کو جنبش دی تھی۔

شاید کسی پرائیویٹ ہسپتال کا کمرہ تھا۔

اسے حرکت کرتے دیکھ کر ایک مستعد ڈاکٹر اس کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔

”آپ اطمینان سے لیٹے رہئے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی جان بچ گئی۔ کوئی گہری
چوٹ نہیں آئی۔ بس تھوڑی تکلیف برداشت کر لیجئے۔ انشاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔“
مہربان آواز سنائی دی۔

ڈاکٹر نے شاید نرس کو اشارہ کیا تھا جو باہر کسی کو اطلاع دینے گئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے
ہما اس کے سرہانے کھڑی تھی۔

”محترمہ! مہربانی ہوگی آپ کی مختصر بات کیجئے۔ ابھی میں مریض کو زیادہ بولنے کی
اجازت نہیں دے سکتا اور براہ کرم باہر موجود کسی بھی شخص کو ابھی اندر نہ آنے دیجئے۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر
باہر نکل گیا۔

نرس نے کمرے کے کونے میں کرسی سنبھال لی تھی۔

”ارسلان! یہ تم نے..... یہ تم نے کیا ظلم کیا اپنے ساتھ..... کیوں گئے تھے ان وحشیوں
کے چنگل میں چھننے کے لئے؟“

اس کی آنکھوں میں آج دوسری مرتبہ وہ آنسو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے ایک مرتبہ وہ
اپنی بے چارگی پر روئی تھی اور آج اس کے لئے رو رہی تھی۔

انانیت کا تناور درخت بوسیدہ شاخ کی طرح ٹوٹ کر گر پڑا۔
”میں اپنی اس حرکت پر شرمندہ نہیں ہوں مس ہما۔ میں نے بہت خلوص سے آپ کو
چاہا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس چاہت میں کہیں ہوس نہ در آئے۔ میں نے کبھی غور سے
آپ کے جسم کو دیکھا ہی نہیں۔ میں تو آپ کی روح سے..... آپ کی.....!“
اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کا گلارندہ گیا۔ وہ کمرے سے قریب ابھا گتا ہوا باہر
نکل گیا۔

○

برآمدے میں اس کا سامنا اچانک ہی کچھ لڑکوں سے ہوا جو یونیورسٹی سے اس طرف آ
رہے تھے۔

”ارسلان!“ جاوید نے اس کا بازو پکڑ کر کہا..... ”ہوش کی طرف نہ جانا۔ ان لوگوں
نے جلوں نکالا تھا۔ گولی چل گئی ہے ان کا ایک لڑکا مارا گیا ہے..... ہمارے دوست بھی شدید زخمی
ہیں۔ بڑی کشیدگی پائی جاتی ہے یونیورسٹی میں! کچھ بھی ممکن ہے تمہیں تو وہ سب جانتے ہیں۔ اگر
تم ان کے قابو میں آگئے تو وہ چھوڑیں گے نہیں۔“

ارسلان اسے ان کی بات سنی ہی کب تھی۔ اس کے دماغ میں تو جھجھک چل رہے تھے۔
اس کی انا تو زخمی پردے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس نے جھٹکے سے جاوید کو الگ کیا اور باہر نکل
گیا۔

رکشے میں سوار ہو کر وہ یونیورسٹی میں ہوش کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ذہن پر تو ایک
بھوت سوار تھا۔ ہما کے عشق کا بھوت!

رکشتہ اس نے سڑک پر ہی چھوڑ دیا اور اب وہ پیدل ہوش کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں
سے جیتنے والوں کے زوردار نعروں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں لیکن وہ ان سب آوازوں سے بے
نیاز اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

”مارو سالے کو!“ اچانک ہی کسی نے ہجوم میں پہچان کر نعرہ لگایا۔

”یہ بھی عاشق ہے اس کا۔ محلوں کی اولاد سلا!“

گالیاں دیتے نوجوان اس پر پل پڑے۔ وہ بے بس جانور کی طرح مار کھاتا رہا۔ اپنی

دھمکیاں دے رہے ہو.....!“

عابد کا لہجہ بھی بدل رہا تھا۔

”اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے بیٹا۔ اس کلمہ ہی نے اس پر جادو کر دیا ہے اور اس کو کچھ

بھائی نہیں دے رہا۔“ اس کی ماں نے بیٹے کی پوزیشن صاف کرنا بہتر جانا۔

اس کے زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو رہے تھے.....!

ہمارے روز اس کی تیمارداری کے لئے آتی۔ اس کا برتاؤ اب قدرے سنجیدہ ہونے لگا تھا۔

سیاست پر وہ کم بات کرتی تھی لیکن ارسلان اب زیادہ گفتگو سیاست پر ہی کرنا پسند کرتا تھا۔



”خدا نخواستہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو جانتے ہو..... جانتے ہو میں مرجاتی.....!“

ارسلان کے ہونٹ گنگ تھے.....!

درد کا احساس دم توڑ چکا تھا۔

”اچھا یہ تم ہو ہمارا اکبر شیر دانی۔ یہ تم ہو..... جو مجھے اپنا نہیں سکتی.....!“ اس نے دل ہی

دل میں کہا۔ ”اور اب تم میرے لئے رو رہی ہو۔“

ایک مسکراہٹ اس کے زخمی ہونٹوں پر جم گئی۔ پھر اس نے کسی فتح کے جذبے سے

سرشار آنکھیں موند لیں۔

ہمارے لپٹی رہی.....!

اسے ڈاکٹر نے خاموش کر دیا..... اس نے ارسلان کو گہری نیند کا انجکشن لگا دیا تھا اور

اب وہ سو گیا تھا۔



اگلے روز اس کے والدین بھی پہنچ گئے تھے۔

ان کے ساتھ عابد بھی آیا تھا۔ یونیورسٹی کی یونین کا نو منتخب صدر حافظ عابد نعیم! جس نے

اسے کہا تھا ایک روز تم بہت پچھتاؤ گے۔

اس نے ارسلان کو تسلی دی! اس کے والدین کو تسلی دی لیکن ارسلان نے محسوس کر لیا تھا

کہ یہ حافظ عابد نعیم کی نہیں ایک سیاست دان کی طفل تسلی ہے۔

”بھائی صاحب! آپ جانتے ہیں میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ محض ایک شخصیت سے

ذہنی یا جذباتی وابستگی کی یہ سزا بالکل نا انصافی ہے۔ میں ان لڑکوں کو پہچانتا ہوں جنہوں نے مجھ پر

حملہ کیا تھا۔ میں پولیس کو کسی کا نام نہیں بتاؤں گا لیکن میں کسی کو معاف نہیں کروں گا۔ آپ جانتے

ہیں ہمارے علاقے کی روایت ہے ہم پہل نہیں کرتے لیکن انتقام نہیں چھوڑتے۔“

آج وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں عابد سے مخاطب تھا۔

”دیکھو عزیز! میں نے تمہیں بہت سمجھایا اور بتا دیا تھا کہ تم غلط راستے پر چل رہے

ہو۔ اس کا انجام یہی ہوتا تھا۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ تم نے اپنے کئے کی سزا اٹھاتی ہے اور

دوسری بات یہ کہ میں یہاں تمہارے لئے نہیں بلکہ اپنے بزرگوں کے لئے آیا ہوں اور تم مجھے

ملک صاحب ارسلان کی خیریت دریافت کر رہے تھے اور اخبار کے لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ کمرے میں پریس کانفرنس کا ماحول بنا ہوا تھا۔ ملک صاحب نے ارسلان کے حق میں اور حملہ آور تنظیم کے خلاف اچھا خاصا بیان جھاڑتے ہوئے حملہ آوروں کو فوراً گرفتار کرنے اور کڑی سے کڑی سزا دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنی پارٹی کی طرف سے ارسلان کو مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہوئے اس کے بہتر مستقبل کے لئے دعا بھی کی۔

اگلے روز کے اخبارات میں اس کی اور ملک صاحب کی تصاویر سے اٹے ہوئے تھے۔ اس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا لیکن اس کی طرف سے ایک لمبا چوڑا بیان حملہ آور تنظیم کے خلاف جاری ہو چکا تھا۔ اخبار نویسوں کی جھببیں گرم کر دی گئی تھیں اور ارسلان جانتا تھا کہ اگر اس نے اپنے بیان کی تردید بھی کرنا چاہی تو کوئی اسے قبول نہیں کرے گا۔

لیکن.....!

اس نے سوچا۔ وہ تردید کرے گا ہی کیوں؟ جب اس نے گندی سیاست کی اس دوڑ میں اپنا گھوڑا دوڑانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے پھر اس میں اتنا ڈیٹینو ہونے کی ضرورت آخر کیا ہے؟ چندہ بیس روز ہسپتال میں گزارنے کے بعد جب وہ ہوشل پہنچا تو ہیرو کی حیثیت سے اسے خوش آمدید کہا گیا۔

اگلے روز وہ گاؤں روانہ ہو گیا لیکن گاؤں میں اس کا دل لگتا کہاں تھا۔ وہ تو جلد از جلد شہر واپس جانا چاہتا تھا۔ زندگی نے اس پر دو طرفہ حملہ کیا تھا۔ اس کی انانیت پر ہمارے ضرب لگائی اور مردانگی کو مخالف طلبہ تنظیم کے لوگوں نے لٹکا رکھا تھا.....!

ایک بے نام سی آگ اسے اندر ہی اندر جھلسا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنی گمشدہ توانائیاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب کسی کا انتظار نہیں کرے گا.....!

وقت کا بھی نہیں.....!

اب وہ خود آگے بڑھ کر اپنے حصے کی خوشیاں زندگی سے وصول کرنا چاہتا تھا۔ خواہ اس کی کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اگر ہمارا کبر شیروانی نے سیاست کو ہی زندگی کا مقصد بنالیا تھا تو وہ

جال

ہسپتال میں آنے کے دوسرے دن ہی سے اسے ملک صاحب کی طرف سے پھولوں کا گلہ سٹہ ملنا شروع ہو گیا تھا۔

ملک صاحب ملک کے معتمد سیاست دان تھے۔ اپنی اصولی سیاست کے لئے وہ عموماً اپوزیشن کی سب ہی پارٹیوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ملک صاحب کی ہمدردیاں انقلابی سنوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ تھیں اور ارسلان کی ایک دو ملاقاتیں ملک صاحب سے ہوئی تھیں لیکن تفصیلی گفتگو کا موقع کبھی نہیں ملا تھا۔ ان ملاقاتوں میں انہوں نے طلباء کو امن و امان سے رہنے اور درس گاہوں کے احترام کا درس ہی دیا تھا۔ ارسلان کے لئے ان باتوں کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں تھی کہ وہ یہاں ہمارے ساتھ آیا ہے اور ملک صاحب ہمارے بہت عزت کرتے تھے۔

صدارت کے لئے انتخاب لڑنے کا مشورہ بھی انہوں نے ہی ہمارا کو دیا تھا۔

اس روز وہ قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا جب اچانک ملک صاحب اپنے سیکرٹری اور ورکرز کی فوج کے ساتھ اس کی ملاقات کو آگئے۔ ان کے تعاقب میں اخبار رپورٹرز اور فوٹو گرافر بھی اس کے کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔

سیاست میں بھی اہم مقام حاصل کر سکتا تھا۔

اس کے پاس ذہن تھا.....!

قابلیت تھی.....!

اور سب سے بڑھ کر ایک مضبوط جسم تھا۔ جس سے وہ مرضی کے مطابق کام لینے پر قادر تھا۔ والدین کے روکنے کی پروا کئے بغیر چار پانچ روز بعد ہی وہ گاؤں سے لوٹ آیا۔

اس مرتبہ جب وہ اپنے نئے ہوٹل میں پہنچا تو ملک صاحب کا سیکرٹری اس کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کی کار میں ملک صاحب کی کوشی کی طرف جا رہا تھا.....!

ملک صاحب نے اس کا استقبال اس طرح کیا جیسے وہ ملک کا منتخب وزیر اعظم رہا ہو۔ اس کے اعزاز میں اچھی خاصی پارٹی کا اہتمام کیا گیا جس میں چیدہ چیدہ نوجوان مدعو تھے۔ یہ لوگ آپس میں خاصے بے تکلف تھے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس پارٹی میں ہمارا موجود نہیں تھی۔

ملک صاحب کا خاص مہمان ہونے کے ناطے ہر نوجوان لڑکی اور لڑکا اس کی طرف متوجہ تھے۔ ہر کوئی اس سے بے تکلف ہونے میں لگا تھا۔

مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے لیکن ملک صاحب نے اسے علیحدگی میں گفتگو کے بہانے روکے رکھا اور رات دیر گئے تک وہ تنہائی میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے ارسلان کو باور کروادیا تھا کہ اس میں ایک بڑا سیاستدان بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ اگر وہ ذرا ہمت کرے تو زندگی اس کے قدموں تلے بچھ جائے گی.....!

ارسلان یہی تو چاہتا تھا.....!

اس روز جب وہ رات گئے ملک صاحب کی گاڑی میں ہوٹل کی طرف جا رہا تھا تو اس کا دماغ ساتویں آسمان پر اڑ رہا تھا۔

جب کبھی اسے احساس ہوتا کہ ہمارا کبر نے اس کی محبت کو ٹھکرایا ہے تو اس کا خون کھولنے لگتا.....!

وہ ہر صورت ہمارا کبر کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ خود میں کوئی ایسی خوبی پیدا کرے کہ پھر ہمارے لئے سوائے اس کی طرف کھینچنے چلے آنے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہ جائے۔

قریباً ایک مہینے کے بعد ایک روز افتخار اس کے ہتھے چڑھ گیا۔

افتخار نے ہی سب سے پہلے وار کیا تھا۔ ارسلان نے اسے یونیورسٹی کے باہر دیوانہ وار پیٹ ڈالا۔ اس نے افتخار کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور ارسلان کے ساتھی اس کا ہاتھ روک لیتے تو شاید وہ افتخار کو جان سے ہی مار ڈالتا۔

بے ہوش افتخار کو کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر پھینکنے کے بعد وہ اپنے دوست کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ موٹر سائیکل کا رخ شہر کی ماڈرن آبادی کے ایک بنگلے کی طرف تھا۔ موٹر سائیکل پر نظر پڑتے ہی چونکدار نے مین گیٹ کھول دیا۔

موٹر سائیکل ایک کونے میں کھڑی کر کے دونوں برآمدے کی طرف چلے گئے۔ پھر ارسلان اپنے ساتھی کے تعاقب میں ڈرائیونگ روم میں داخل ہو گیا جہاں ایک آرام دہ صوفے پر ملک صاحب آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔

”ویل ڈن مائی بوائے! ویل ڈن! میں نے کہا تھا کہ تم آگے نکلو گے۔ تم میں بہت کچھ کر گزرنے کی سکت ہے۔“ انہوں نے بے تکلفی سے ارسلان کو گلے لگاتے ہوئے اس کے ماتھے کو بوسہ دیا۔

”وڈر فل! بہت اچھا کیا تم نے۔ یاد رکھو اس ملک میں شریف آدمی کو بزدل اور..... کہتے ہیں۔ یہاں خود کو منوانا پڑتا ہے۔ بالی ہک یا بالی کرک..... جیسے بھی۔ یہ لوگ شرافت کی زبان نہیں سمجھتے۔ مجھے دیکھو میں بیس سال سے بکواس کر رہا ہوں۔ کوئی میری بات پر کان دھرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ میری زبان ہی کسی کو سمجھ نہیں آتی۔ ٹھیک ہے اسمبلی کے الیکشن میں جیت جاتا ہوں لیکن مفت نہیں..... لاکھوں خرچ کرنے کے بعد..... اور یہ کوئی ”کرائی میریا“ بھی نہیں۔ تم میری جگہ کسی عام آدمی کو لاکھوں روپے کی مدد سے اس ملک کا وزیر بنا سکتے ہو..... بہت اچھا کیا تم نے..... ان لوگوں کو جواب ملنا ہی چاہئے۔ ارے کوئی تو مائی کالا ل ایسا ہو.....!“ وہ خاموش ہو گیا۔

”سرجی! ابھی تم ہم نے ارسلان صاحب کے اور بہت سے بدلے چکانے ہیں۔“ اس کے ہمراہی نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے دوسرے کمرے میں رکھے فریج سے ایک بوتل نکالی اور گلاس اٹھا کر وہیں چلا آیا۔

”یہ کیا؟“ ارسلان نے کہا۔

”اس کے بہت سے نام ہیں پیارے اور کام بھی بڑے کرتی ہے۔ بڑا آدمی بننے کے لئے تو اس سے دوستی ناگزیر ہے۔“

اختر نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

”میں شراب نہیں پیوں گا۔“

ارسلان نے اپنی دانست میں بڑا مضبوط فیصلہ کیا تھا۔ یہ فیصلہ بھی ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ نہ نہ کرتے ہوئے بھی اس نے ایک گلاس چڑھالیا۔

اس کے بعد اختر نے وی سی آر کا سوئچ آن کر دیا اور اب جو فلم ٹی وی پر چل رہی تھی اس نے ارسلان کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑادی۔ فلم کے خاتمے پر عارفہ کھانا لے کر آئی تو ارسلان کے ذہن کو شیطان نے اپنی مکمل گرفت میں لے لیا تھا۔

اسے احساس ہی نہ ہوسکا کہ کب کھانے کے بعد ان لوگوں نے سونے کا پروگرام بنالیا اور وہ عارفہ سمیت بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ ساری رات شیطان اپنی فتح پر قہقہے لگاتا رہا۔ عارفہ تجربہ کار شکاری تھی۔ اسے تنخواہ ہی شاید اس بات کی دی جاتی تھی۔ صبح ہونے تک ارسلان کی پاکیزگی بھی خون ہو چکی تھی۔ آج اس نے وہ کھیل کھیل لیا جس کا عام حالت میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

صبح جب وہ اپنے کمرے میں اوندھے منہ سو رہا تھا تو اختر ملک صاحب کو یہ خوشخبری فون پر سن رہا تھا کہ شکاری پوری طرح جال میں پھنس چکا ہے۔

”مشن او۔ کے ہو گیا سرجی!“ اس نے فون پر کہا۔

”ونڈرفل! شاباش! بچ کر نہ جائے بندہ بڑے کام کا ہے۔ اب آگیا ہے تو اسے ہاتھ

سے نکلنے نہیں دینا۔“

اس نے فون پر اختر کو ہدایت دی۔

”سرجی! آپ فکر ہی نہ کریں جی!“ اختر نے بے حیائی سے دانت نکالے۔ فون کا

سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

”کیوں نہیں؟ کیوں نہیں۔ ارے جب تک میں زندہ ہوں۔ کوئی تمہاری ہوا کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ جو تمہارا دل چاہے کر ڈ میں سنبھال لوں گا۔ چیف منسٹر میری جیب میں پڑا ہے۔۔۔۔۔ اس بات کا علم آئی جی کو بھی ہے اور اس شہر کے ایس ایس پی کو بھی۔۔۔۔۔ اچھا ابھی میں چلتا ہوں۔ پولیس کے معاملات بھی سنبھالنے ہیں۔ تم لوگ آج رات یہیں رکنا رات تک میں پولیس کو سنبھال لوں گا۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔ ارسلان بیٹا! تم یہ رکھ لو۔“ اس نے اپنے برف کیس سے نوٹوں کا ایک بڈل نکال کر ارسلان کی طرف پھینک دیا۔ ”اور تم اختر میاں یہ رکھ لو۔“ اس نے چھوٹا ایک بڈل اختر کی طرف پھینکا۔

ارسلان نے کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا لیکن اختر نے جھپٹ کر بڈل اٹھایا اور اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

”بھئی ہمارے مہمان کا خاص خیال رکھنا۔ اسے احساس ہونا چاہئے کہ ملک کا مہمان ہے۔“ اس نے اختر کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

”سرجی! آپ فکر ہی نہ کریں۔ ارسلان صاحب کو خوش کر دیں گے۔“ اختر نے بے حیائی سے دانت نکال دیئے۔

”عارفہ گھر پر موجود ہے۔ کھانا وغیرہ اس سے تیار کروالینا۔“ جاتے جاتے اس نے رک کر اختر کی طرف دیکھا۔

”او کے سرجی!“

○

”یار! یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ پیسوں کی کیا ضرورت تھی؟“

ملک صاحب کے جاتے ہی ارسلان نے اختر سے کہا۔

”جان دے پاپے۔ جان دے۔ کیوں ہم غریبوں کے پیٹ پر بھی لات مروائے گا۔

پیارے تم تو انسان ہو۔ یہاں تو کتے بھی پیسے کے بغیر ڈھنگ کی زندگی نہیں جی سکتے۔ ارسلان

صاحب! یہ سارا کھیل ہی مایا کا ہے۔۔۔۔۔ مایا کا۔۔۔۔۔ اب تم بڑے ”جوڑوں“ میں آگئے ہو۔ چھوٹی

چھوٹی باتیں سوچ کر ذہن کو پریشان نہ کیا کرو۔ ابھی آگے آگے دیکھو کیا کیا نظارے دکھاتا

ہوں۔“

نے سٹوڈنٹس پالیٹکس سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اب ارسلان انقلابی سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ کبھی کبھی دونوں کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا تو دونوں ہی ٹکڑ ٹکڑ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔

اس روز تو ارسلان حیران ہی رہ گیا جب ہما اکبر شیردانی اس کے ہوٹل میں ملنے آئی۔
”میں یونیورسٹی چھوڑ رہی ہوں۔“ اس نے ارسلان سے کہا۔

”اس اطلاع کا شکریہ لیکن آپ مجھ سے کس رد عمل کی توقع رکھتی ہیں؟“ ارسلان کا لہجہ خاصا طنزیہ تھا۔

”تم بہت اونچے اڑ رہے ہو ارسلان! چھوٹی کشتیوں کو سمندر کے درمیان جانا زیب نہیں دیتا۔ اب بھی وقت ہے کنارے کی طرف لوٹ آؤ..... ہاں یہ بھی سن لو کہ اب تم کوئی بھی رد عمل ظاہر کرو گے تو اس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ اب تم میں موجود معصومیت اور حیا مریچکی ہے۔ اب تم ہماری صف میں کھڑے ہو گئے ہو ارسلان۔ کاش تمہاری اور میری ملاقات کبھی نہ ہوئی ہوتی۔ میرے ضمیر کو یہی ایک خلش ترپاتی رہے گی اس راستے پر تمہیں گامزن کرنے میں کہیں نہ کہیں میرا حصہ ہے..... ارسلان خدا کے لئے اب بھی وقت ہے لوٹ جاؤ۔ یہ سب فراڈ ہے۔ مجھے سب کچھ گناہ کا احساس ہوا ہے کہ یہ دھوکہ ہے دھوکہ..... تم دھوکے کی نگری کے مسافر بن چکے ہو..... یہ راستہ صرف ایک سمت کو جاتا ہے..... تباہی کی سمت.....“

اس کا گلارندہ گیا تھا۔ اس کے لئے بولنا محال ہو رہا تھا۔ بڑے صبر سے اس نے اپنے آنسو روک رکھے تھے.....!

”ارسلان! میں نے کوشش کی تھی کہ اپنا فرض نبھاتے ہوئے تمہیں تباہی کے اس گڑھے کی طرف بڑھنے سے روک لوں جس کی طرف تم برق رفتاری سے بڑھ رہے ہو لیکن..... افسوس میں نے دیر کر دی۔ خدا تمہاری حالت پر رحم فرمائے۔“ یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی باہر نکل گئی۔
”حاسد..... جل گئی سالی!“ اختر نے ارسلان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔

وہ اسے خبر دینے آیا تھا ملک صاحب نے اس کو نئی موٹر سائیکل تھے میں دی ہے اور اختر اس کی چابیاں ہی اسے دینے آیا تھا۔

”تمہاری شہرت اس کو ہضم نہیں ہو رہی۔ تم نہیں جانتے اس عورت کو۔ آج تک کوئی

تھوڑی دیر بعد ارسلان غسل خانے میں موجود تھا۔ جب وہ نہا کر باہر نکلا تو اس کا استقبال سب سے پہلے عارفہ نے کیا تھا۔ وہ بے تکلفی سے ارسلان سے لپٹ گئی تھی۔

ارسلان نے تو جیسے مکمل سرنڈر کر دیا تھا.....!

اختر کام کا بہانہ کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد تمام معاملات عارفہ نے سنبھال لئے اور ارسلان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر وہیں کا ہو رہا۔

یہی ملک چاہتا تھا۔

اس نے شام تک پولیس کے تمام معاملات پورے کر دیئے۔ وہ رات بھی اس نے ملک کے گھر بسر کی اور اگلے روز جب وہ صبح کے وقت وہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو ملک کی طرف سے ملنے والی آدھی سے زیادہ رقم اس نے عارفہ کو انعام میں دے دی۔

یہاں سے وہ اس فیضیت کے ساتھ رخصت ہوا تھا کہ کبھی بھول کر بھی کسی سے یہ تذکرہ نہیں کرے گا کہ اس نے رات ملک صاحب کے کسی بنگلے پر بسر کی تھی یا ملک صاحب سے اس کی کوئی ملاقات بھی کبھی ہوئی تھی۔

○

یہ آغاز تھا.....!

ارسلان نے اس راستے پر اپنا سفر اتنی تیزی سے شروع کیا کہ کبھی اسے خود بھی شک ہونے لگتا کہ وہ واقعی وہی ارسلان ہے.....!

اس نے پانچ چھ ماہ کے عرصے میں تھانے، کچہری، جیل سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ ہر جگہ ملک اس کے اور قانون کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اخبارات چیختے چلاتے رہے کہ ارسلان کو ملک کی پشت پناہی حاصل ہے لیکن اخبارات کی ان خبروں کا رد عمل سوائے چند مذمتی بیانات کے اور کچھ نہ ہوتا۔

شراب اور شباب نے اسے اپنا اسیر بنا لیا تھا کہ اب اس کی رہائی مشکل نظر آتی تھی۔ اس درمیان وہ ہمارے لائق یا بے خبر نہیں رہا تھا۔ ہمارے ایک پھانس کی طرح اس کے دل میں انک کر رہ گئی تھی۔

یونیورسٹی اس کا جانا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ اس دوران اس نے خاص طور پر یہ نوٹ کیا کہ ہما

جھکا نہیں سکا۔ تم نے اسے نیچا دکھا دیا ہے اور یہ معمولی بات نہیں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے ارسلان کہ تمہاری کیا پوزیشن بن چکی ہے۔ اگلے الیکشن میں تمہیں کوئی بھی پارٹی ہاتھ باندھ کر ٹکٹ دے سکتی ہے۔ تم بس آگے کی سمت دیکھو۔ آگے دیکھو۔ آگے بڑھو۔ آگے نکلو۔ زندگی پلٹ کر دیکھنے والوں کو اندھا کر دیا کرتی ہے ارسلان.....!“ اختر نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا.....“ اور ہاں یار تم نے اس پر کیا جادو کر دیا ہے۔ ہر وقت تمہارا ذکر کرتی رہتی ہے۔ آج اس سے مل لینا ورنہ عارف مجھے معاف نہیں کرے گی۔“

دونوں اکٹھے ہی باہر آئے تھے.....!

نئی موٹر سائیکل اور عارف کے ساتھ شب ب سری.....!

ملک کا شکوہ اس کے گرد تک ہو رہا تھا! اس کی گرفت ارسلان کے حلقوم پر سخت ہو رہی تھی اور اسے احساس نہیں ہو رہا تھا۔

o

ملک کے گھر سے نکل کر وہ اپنی نئی موٹر سائیکل پر ہوٹل کی طرف آ رہا تھا۔

کالج روڈ کا چوک مڑتے ہی ایک سفید رنگ کی وگن نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ اس تعاقب کا احساس ارسلان کو اس وقت ہوا جب اچانک ہوٹل کی سڑک گھومتے ہوئے وگن اس کے بالکل سامنے آ گئی۔

موٹر سائیکل کو بریک لگاتے لگاتے وہ وگن سے ٹکرا کر گر پڑا..... گرنے سے اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس نے غصے سے اٹھ کر کھڑا ہونا چاہا لیکن اچانک ہی سر پر لگنے والی ہانکی کی ضرب نے اس کو دن میں تازے دکھا دیئے۔

اندھیرے میں ڈوبتے اس کے ذہن پر جو آخری منظر نقش ہوا وہ ان اجنبی اور شناسا چہروں کا تھا جو وگن سے اتر کر ہاتھوں میں ہاکیاں تھامے اس پر حملہ آور ہوئے تھے۔

شاید ان میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں پستول بھی تھام رکھا تھا۔

ارسلان کو ہوش آیا تو وہ کسی زمین دوز کمرے میں فرش پر پڑا تھا۔

کسی نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ اس کے سامنے پانچ نقاب پوش کھڑے تھے۔

”کون ہو تم؟“ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن پنڈلی پر پڑنے والی ضرب نے اسے دوبارہ زمین پر گرادیا۔

اس کے ساتھ ہی چاروں اس پر پل پڑے۔

انہوں نے ارسلان کو زیر تفتیش مجرموں کی طرح کمرے کی چھت سے لٹکتی دولوہے کی زنجیروں میں باندھ لیا تھا۔ اس کی دونوں کلائیاں زنجیروں سے بندھی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں میں ایسی ہی زنجیر ڈال دی گئی۔

اس دوران اغوا کنندگان نے اس سے اپنا تعارف کروادیا۔

”تم کیا سمجھتے تھے کہ وہ حرامی کی اولاد ملک ہر جگہ تجھے بچالے گا۔ اسے کہو گورنر چیف منسٹر یا آئی جی سے کہہ کر تمہیں سزا سے بچالے۔ کتے کے پلے! تم نے افتخار کو مار ڈالا۔ ہم تمہارے ہاتھ تمہارے جسم نے الگ کر دیں گے۔“

ایک غصیلی آواز نے اسے گالیاں بکتے ہوئے کہا۔

ارسلان سمجھ گیا کہ وہ مخالف تنظیم کے قابو میں آ چکا ہے اور معافی مانگنے یا گڑ گڑانے پر بھی خیر کی کوئی توقع نہیں تھی۔

اس نے دیوانہ وار انہیں گالیاں دینا شروع کر دیں جس کے ساتھ ہی چاروں حسب توقع اس پر ستم آزمائی کرنے لگے۔

اس درمیان میں وہ دوسرے بے ہوش ہوا لیکن ہر دفعہ ہوش میں لانے کے بعد وہ لوگ باقاعدہ ماہر ڈاکٹروں کی طرح اس کی نبض اور بلڈ پریشر چیک کرتے۔

ان کا لیڈر اس کے بعد جیل کے ڈاکٹروں کی طرح انہیں دوبارہ مار کٹائی کا سگنل دیتا اور وہ اس پر تشدد کرنے لگتے۔

شام گئے تک یہ عمل جاری رہا۔

اس درمیان وہاں مختلف تنظیموں کے لوگ آتے جاتے رہے۔ وہ ارسلان سے ایک سفید کاغذ پر دستخط کروانا چاہتے تھے لیکن شام گئے انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ مرتا مر جائے گا لیکن جیتے جی دستخط نہیں کرے گا۔

”ٹھیک ہے“ مہر“ لگا کر رہا کر دو۔ اگر یہ ہمارا مہمان بنا ہے تو ہماری نشانی لے کر ہی

شکار اور شکاری

ملک پائپ منہ سے لگائے ٹیلی فون کے نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ جب اچانک فون کی گھنٹی بجی۔

”ہیلو.....!“ دوسری طرف اختر مخاطب تھا۔

”سرجی! کام ہو گیا۔ بالکل آپ کے حکم کے مطابق میں نے ان کے خاص آدی کو فون پر مطلع کر دیا تھا کہ ارسلان کدھر جا رہا ہے۔ انہوں نے اسے کالج روڈ کے قریب ہی قابو کر لیا۔ موٹر سائیکل وہیں پڑی رہی اور وہ اسے اپنے ”انٹیر وکیشن سنٹر“ میں لے گئے تھے۔“

”تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا بکواس کر رہے ہو؟“

ملک آج بالکل بد لے ہوئے لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

”خدا کی قسم سرجی! میں نے ان لوگوں کو اپنی آنکھوں سے ارسلان کو اغوا کرتے دیکھا

تھا۔“

اختر پالتو سکتے کی طرح مالک کی وفاداری میں دم ہلا رہا تھا۔

”ویل ڈن! شاباش۔ خوش کر دیا۔ اب میں دیکھوں گا۔ اب کھیل کا مزہ آئے گا۔“

کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

واپس جائے۔“ ان کے لیڈر نے احکامات جاری کئے۔

کسی نے اس درمیان استری کا پلنگ لگا دیا تھا۔ جب استری آگ کی طرح دہکنے لگی تو پلنگ اتار کر اسے الگ کر لیا گیا۔

تشد سے نیم بے ہوش ارسلان کی گالیوں پر کان دھرے بغیر ان میں سے ایک نے اس کی کمر سے قمیص پھاڑ کر الگ کر دی۔ دوسرے لڑکوں نے اس کی بے بسی پر ہتھ لگایا۔

اس کے ساتھ ہی آگ کی طرح دہکنی استری اس کی کمر سے چپاں کر دی گئی۔ اس کے جسم سے کھال جلنے لگی تھی۔ اس کے منہ سے ذبح ہونے والے بکرے کی طرح زوردار آوازیں نکل رہی تھیں۔ بمشکل ایک منٹ کی اذیت وہ برداشت کر سکا۔ پھر بے ہوش ہو گیا۔

بے ہوش ارسلان کو ان لوگوں نے سڑیچر پر ڈالا اور اندھیرے میں کھڑی ایک ایسبولینس تک لے آئے۔ سڑیچر ایسبولینس میں منتقل کرنے کے بعد انہوں نے ایسبولینس سٹارٹ کی جس کا رخ نزدیکی ویران سڑک کی طرف تھا۔ ارسلان کو نہ تو آتے ہوئے اور نہ ہی یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے علم ہوا کہ اسے کہاں لایا گیا ہے اور کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ سڑک کے ایک ویران گوشے میں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کے نزدیک انہوں نے ارسلان کو گندگی کی طرح پھینکا اور رفو چکر ہو گئے۔



البتہ اس کے ہونٹوں سے چپک گئی۔

”بیٹا! تم کون ہو؟ کیا بات کر رہے ہو؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ ارے دیکھو
برخوردار بزرگوں کو گالیاں نہیں دی جاتیں.....!“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی رابطہ کٹ گیا۔

ملک کی آنکھوں میں شیطانی چمک بیدار ہو گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی دوسرا فون اٹھایا۔

اب وہ کسی اخبار کے دفتر میں سلامی صاحب کو تلاش کر رہا تھا۔

”جی سلامی صاحب! آپ کا خادم بول رہا ہوں۔“

”جناب خادم تو ہم ہیں آپ کے بلکہ ہم تو ساری قوم کے خادم ہیں۔“ سلامی کی مریل

سی آواز سنائی دی۔

”بھئی فوراً اپنا فون گرافر اور رپورٹر مین روڈ کے کارنر پر جو کوڑا کرکت پھینکے والا ڈرم

ہے وہاں بھیج دو۔ ایک اہم خبر تمہاری منتظر ہے اور ہاں تصاویر سمیت زوردار سرخیاں لگا کر خبر دینا۔

بس دکھا دو اپنی صحافت کا کرشمہ!“

ملک کی آواز سے خوشی ٹپک ٹپک پڑتی تھی۔

”جناب فکر ہی نہ کریں۔ نوکر کیا اور خیر کیا! وہ میرا پلاٹ والا معاملہ.....!“ سلامی نے

ٹیلی فون کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

”سلامی صاحب آج تک آپ کا کون سا کام رکا ہے۔ ارے ہم تو یاروں کے یار

ہیں۔“ ملک نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر فون بند کر دیا۔

اس نوعیت کا فون ملک نے ایک اور اخبار کے دفتر میں بھی کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے

اختر سے کہا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ جا کر ارسلان کو اٹھالائے۔

لیکن.....!

ان لوگوں کو بھی خاص ہدایت دی گئی تھی کہ وہ فون گرافروں کے کام میں رکاوٹ نہ

ڈالیں، بھلے طبی امداد لیٹ ہو جائے۔

پولیس، طلباء اور اخبار والے اکٹھے ہی جائے حادثہ پر پہنچے تھے اور سب تن من سے اپنے

اپنے کام میں مصروف تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے سٹڈی روم میں موجود تھا جہاں ایک مقامی اخبار کارپورٹر اس
سے طلباء سیاست میں تشدد کے رجحان پر انٹرویو لے رہا تھا اور ملک بڑھ چڑھ کر اس تشدد کے
رجحان کی نفی میں دلائل پیش کر رہا تھا۔ اس کے کہنا تھا اگر جلدی ہی اس عفریت پر قابو نہ پایا گیا تو یہ
درسگاہوں کے سکون کو نگل جائے گی پھر کالجوں کو جانے والے بچوں کی زندگیوں کی ضمانت کوئی
نہیں دے سکے گا۔

اس نے مروجہ تشدد کی ساری ذمہ داری مقامی انتظامیہ اور ایک طلباء تنظیم پر عائد کرتے
ہوئے کہا تھا کہ ان لوگوں نے درسگاہوں کو بد معاشی کے اکھاڑے بنا کر ان کے تقدس کو نگل لیا
ہے۔

انٹرویو کے خاتمے پر جب متعلقہ رپورٹر باہر نکلا تو ملک کا سیکرٹری بھی اس کے ساتھ ہی
باہر تک آیا تھا۔ وہ رپورٹر کو اپنی گاڑی میں اس کے اخبار کے دفتر چھوڑنے جا رہا تھا۔

”سرجی یہ رکھ لیں۔“ اس نے تھوڑی دور جا کر ڈیش بورڈ میں رکھا ایک لفافہ اس کی
طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا.....؟ ارے اس کی کیا ضرورت تھی۔“ رپورٹر نے بے شرمی سے دانت نکالتے
ہوئے لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

”اوجی! یہ تو جناب آپ لوگوں کا حق ہے۔ دیکھئے نا! اگر آپ مہربانی نہ کریں تو ہم
لوگوں کو کون پوچھے گا.....!“

سیکرٹری اس سے بھی زیادہ بے شرم دکھائی دے رہا تھا۔

○

ملک اپنے کمرے میں ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا جب فون کی کھنٹی بجی۔

”ہیلو.....!“ اس نے معمول کے مطابق نہایت مہذب قسم کی آواز نکالی۔

”اپنے پالتو کتے کو میس روڈ کے کوڑے کرکٹ والے ڈرم سے وصول کر لو اور ہاں خیال

رکھنا ایک روز ہم تمہارا بھی یہی حشر کریں گے۔“ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے مغلظات کا
طوفان ابلنے لگا۔

کیا مجال جو گالیاں سن کر ملک کے ماتھے پر شکن بھی آئی ہو۔ ایک مکارانہ سی مسکراہٹ

معاملہ آن پڑا۔ میں نے انکار نہیں کیا۔ اگر پولیس امن وامان نہیں چاہے گی تو کون امن وامان سے زندہ رہ سکے گا؟ آپ مطمئن رہئے میں انشاء اللہ کوشش کر رہا ہوں۔“

آئی جی کا دل تو چاہتا تھا کہ اس کا منہ نوح لے لیکن مصلحت نے اس کی زبان پر تالا لگا دیا تھا۔

آئی جی صاحب ایمان دار آدمی تھے لیکن بد قسمتی سے ہوم منسٹر کے رشتہ دار بھی تھے جن کا تعلق ملک صاحب کی مخالف پارٹی سے تھا اور آئی جی صاحب اندازہ لگا سکتے تھے اس ”ایٹو“ پر ملک جیسے سیاست دان کیا طوفان نہیں کھڑا کر سکتے۔

ملک کا فون ابھی بند ہی ہوا تھا جب آئی جی صاحب کا دفتر طلباء کے نعروں سے گونجنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر ان کے امتحان کا وقت آ گیا تھا۔ انہوں نے اپنی ٹوپی سنبھالی، طلباء کے نمائندوں کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔

پھرے ہوئے طلباء کا مطالبہ تھا کہ آئی جی ان سے باہر آ کر مذاکرات کرے۔

بادل خواستہ آئی جی کو باہر آ کر بات کرنا پڑی۔ ان کی قوت برداشت کا ہر طرح سے امتحان لیا گیا لیکن ان کے پاس سوائے ضبط کے اور چارہ بھی کیا تھا۔ آئی جی صاحب نے جھوم کو یقین دلایا کہ شام تک وہ ملازموں کو گرفتار کر لیں گے۔ جھوم کی طرف سے شام تک گرفتاری نہ ہونے کی صورت میں دوبارہ ہنگامہ آرائی کی دھمکیاں دی گئیں۔

شام تک انتظامیہ کے دباؤ پر آئی جی نے پرچے میں نامزد بے گناہ ملازمان کو گرفتار کر ہی لیا۔

اگلے روز جب انہیں ریماڈ لینے کے لئے عدالت میں پیش کیا گیا تو چاروں ملازمان کے وکیلوں نے حادثے کے وقت ان کی مصروفیات اور جگہ ثابت کر دی۔ دو چار روز جیل میں رہنے کے بعد ان کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

○

ارسلان کے زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو رہے تھے۔

اس کے والد نے اس کی گھٹیا حرکتوں کے پیش نظر اس کی شکل دیکھنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

○

ارسلان کو اس کے ساتھی فوراً نزدیکی ہسپتال لے گئے۔ اخبارات والوں نے اپنا کام شروع کر دیا اور پھر پولیس نے انقلابی سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکرٹری اطلاعات ملک اختر نواز کا بیان قلمبند کرنا شروع کر دیا۔ جس نے اس حملے کی ساری ذمہ داری مخالف تنظیم پر ڈال کر اس کے چار پانچ متحرک کارکنوں کے نام ایف آئی آر میں بطور ملزمان لکھوا دیئے تھے۔

صبح کے اخبارات نے یہ خبر نمایاں طور پر شائع کی تھی۔ طلباء برادری میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ملک کی ہدایت پر ایک جلوس آئی جی کے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ آئی جی تک جلوس پہنچے ان کے فون کی گھنٹی بجی۔

○

آئی جی صاحب نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف مشہور اور معتبر سیاسی رہنما ملک صاحب لائن پر آ گئے۔

”آئی جی صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ کی تشریف آوری کے بعد محض ایک ہفتے میں یہ چوتھا واقعہ ہے۔ اگر آپ لوگوں نے میری بکواس پر کان دھرے ہوتے اور پہلے ہی حادثے پر ملازمان کو کیفر کردار تک پہنچایا ہوتا تو یہ نوبت ہرگز نہ آتی.....!“

”ملک صاحب ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اگر سختی کریں تو بھی آپ لوگ ہمارے خلاف بیان بازی شروع کر دیں گے۔ میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے نہ اللہ دین کا چراغ ہے.....!“

”آئی جی صاحب! ذرا سنبھل کر بات کیجئے۔ ٹھیک ہے ہوم منسٹر سے آپ کی رشتہ داری ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ عوامی نمائندوں کی بے عزتی شروع کر دیں۔ میں کچھ نہیں جانتا، آپ کو آج شام تک بہر صورت ملازمان کو گرفتار کرنا ہو گا اور ہاں اگر شام تک آپ کوئی کرشمہ نہ دکھا سکے تو یہ معاملہ یہاں نہیں رکے گا۔ میں چیف منسٹر سے بات کروں گا۔ آئی جی صاحب! آپ نے جمہوریت کو مذاق سمجھ رکھا ہے کیا؟“

اس نے آئی جی کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔

”دیکھئے ملک صاحب! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور اس میں رشتہ داری کا کیا

”ٹھیک ہے۔“ ارسلان ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”جذباتی نہیں بننا بیٹا! ذرا سنبھل کے۔ پلاننگ کے ساتھ اور ہاں خطرہ مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کام مکمل ہوتے ہی نکل جاؤ۔ اگر گرفتاری ناگزیر ہوگی تو یہ دونوں گرفتاری دیں گے۔“

اس نے قربانی کے دونوں بکروں کی طرف اشارہ کیا جنہوں نے اطاعت میں گردن جھکا دی۔

چند روز بعد وہ عابد کی ایک جگہ موجودگی کی اطلاع پر ایک ویگن میں مسلح ہو کر عازم سفر تھے۔ وہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر حافظ عابد کو قتل کرنے جا رہے تھے تاکہ خوف دہشت اور غنڈہ گردی کے ذریعے اگلے الیکشن میں کامیابی حاصل کر سکیں۔

○

مقامی کالج میں الیکشن قریب آرہے تھے۔ حافظ عابد طلباء تنظیم کا صدر تھا اور اس کالج میں اپنی تنظیم سے متعلق انتخابات میں حصہ لینے والے پیٹل کی انتخابی مہم کے سلسلے میں ایک جلسہ سے خطاب کرنے آیا تھا۔ ان لوگوں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں اور جانتے تھے کہ ارسلان اپنی پیٹھ پر لگے کھاؤ کو دیکھ کر اکثر تملتا ہوگا۔

انہیں علم تھا کہ ارسلان جیسے نوجوان جب ملک صاحب جیسے لیڈروں کے ہتھے چڑھ جائیں تو پھر ان کی سوچ اپنی سوچ رہتی ہے نہ ان کا جسم اپنا جسم رہتا ہے۔ ان کو پھر ملک جیسے گھاگ اور شاطر کھلاڑی اپنی انگلیوں کے اشارے پر بچاتے ہیں۔

کالج کی گراؤنڈ مین گیٹ کے سامنے نظر آرہی تھی جہاں حافظ عابد کی تنظیم کا انتخابی جلسہ ہو رہا تھا لیکن اس بات کا علم بہت کم لوگوں کو تھا کہ ان کے ساتھیوں نے کالج کی چھت پر مورچے قائم کر رکھے تھے اور وہ کسی بھی ناگہانی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

جلسے کے آغاز سے پہلے ہی انہوں نے کالج کی چھت پر مورچے باندھ لئے تھے.....!!

○

وہ کسی ناگہانی آفت کی طرح نازل ہوئے تھے۔ سب سے پہلے ڈرائیور کے ساتھ والی

ایک ماں کی ذات تھی یا پھر بھائی اور بہن جو اس روگ کے خود بھی روگی بن رہے تھے اور ان سب سے بڑھ کر ہما اکبر شیروانی تھی جس نے ارسلان کی خدمت جی جان سے کی۔ وہ رورو کر ہاتھ باندھ کر اس کی منتیں کرتی رہی کہ وہ اس راستے سے لوٹ جائے۔

لیکن.....!

ارسلان نے لوٹ جانے کے لئے یہ راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ تو زندگی کی دوڑ میں دیوانہ وار آگے نکلنا چاہتا تھا۔ خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنا پڑے۔

ملک اور اس کا شیطانی گردہ اس سے چمٹا رہا۔ وہ لوگ تیمارداری کے ساتھ ساتھ انتقام کے جراثیم اس کے خون میں انجیکٹ کرتے رہے اور جب وہ صحت مند ہو کر واپس آیا تو ملک نے اس کو ہوشل جانے سے منع کر دیا۔ اس کی رہائش کا خصوصی بندوبست کیا گیا تھا۔

کلاشکوف اس کے ہاتھوں میں تھما دی گئی تھی!

اس کے ذہن میں انتقام کا لاوا پک رہا تھا!

عارفہ اس کے الاؤ کی پیش بڑھانے کے لئے اس کے پہلو سے چمٹا دی گئی تھی۔

○

اس روز وہ ملک کے گھر ایک اہم میٹنگ کے لئے اکٹھے ہو رہے تھے۔ وہ پانچ تھے۔

ارسلان، اختر رفیق اور دو ملک کے فراہم کردہ غنڈے! انہیں ایک اہم مشن سونپا جا رہا تھا۔

”حافظ عابد اس شرارت کی جڑ ہے۔ جب تک یہ شخص زندہ ہے تمہیں چین کی زندگی نہیں جینے دے گا۔ اس کے جیتے جی یونیورسٹی کا کوئی الیکشن تم نہیں جیت سکتے۔ اسے مار ڈالو.....“

ملک کا لہجہ خونخوار ہو رہا تھا۔

”بالکل ٹھیک کہا سرجی! بالکل ٹھیک۔ میں تو آپ سے ہمیشہ یہی کہتا آیا ہوں کہ پاگل کو نہیں اس کی ماں کو مارو۔“ اختر مکاری کی تصویر بنا بیٹھا تھا.....!

”درخت کی جڑوں کو کاٹ ڈالو بیٹا! ٹہنیاں سوکھ کر گر جائیں گی اور یہ جو پتے ہیں ناں..... یہ تو ہوا کا جھونکا برداشت نہیں کر پائیں گے خشک ہو جائیں گے اور تم جانتے ہو خشک پتے

معمولی ہوا میں بکھر جاتے ہیں۔“

ملک کسی عفریت کی زبان میں پھکار رہا تھا۔

سیٹ پر موجود ارسلان باہر نکلا اور حافظ عابد کو گالیاں دیتا ہوا سٹیج کی طرف لپکا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھیوں نے دین سے نکل کر اندھا دھند ہوا میں گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ حملہ آور شاید اس ”کاؤنٹر حملے“ کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ انہیں لینے کے دینے پڑ گئے کیونکہ بلندی سے گولیاں برسانے والوں کو ان پر ہر لحاظ سے برتری حاصل تھی۔

ملک صاحب کے فراہم کردہ دونوں غنڈے تو پہلی ہی بوچھاڑ پر دم دبا کر بھاگ نکلے۔ یوں بھی ان کا کام اب ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ لڑائی کا آغاز کر دانا تھا۔ اس کے بعد دونوں پارٹیاں آپس میں غمیں۔ ان کا دوسرہ نہ تھا۔

ملک بڑا گھاگ سیاست دان تھا۔ معمولی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر وہ اس مقام تک پہنچا تھا۔ اسے علم تھا کہ طلباء کی کسی ہنگامہ آرائی میں کسی غیر طالب علم کی گرفتاری کیا گل کھاسکتی ہے۔

عین ممکن تھا گرفتار ہونے والے دوسری پارٹی کے ہاتھوں پکڑے جاتے یا پولیس تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے اصلیت بک دیں اور اس کا سارا سیاسی کیریئر داؤ پر لگ جائے۔ اس نے تو ان دونوں کو صرف ارسلان کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ساتھ کیا تھا ورنہ تو اصل کام ارسلان نے ہی کرنا تھا۔

طالب علموں میں بھگدڑ مچی تھی.....!

اپنی جانیں بچانے کے لئے جس کا منہ جدھر اٹھا وہ بھاگ نکلا۔ خوفزدہ اور سہمے ہوئے بے چارے شریف اساتذہ مختلف کمروں میں اپنی جانیں چھپائے ہوئے تھے۔ کسی کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ وہ پولیس کو ٹیلی فون ہی کر دیتا۔

شاید ان لوگوں کو علم تھا کہ کالج سے بمشکل پندرہ بیس گز دور موجود پولیس کے ٹرک اگر اپنی جگہ سے اس ہنگامہ آرائی کے باوجود جنبش نہیں کر سکے تو ان کے ٹیلی فون سے ان کی ٹانگوں میں حرکت آنے سے رہی۔

ارسلان کی نظریں حافظ پر جمی تھیں اور وہ پستول تھاے اس کے تعاقب میں لپکا۔ عین اس مرحلے پر جب حافظ عابد اس کی ریچ میں تھا اس نے پستول عیدھا کیا تو ارسلان کی ماں ایک سوال بن کر سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”بیٹا! عابد نے تمہیں اور تمہاری بہن کو قرآن پڑھایا ہے۔ ہم ساری زندگی صرف ایک احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتے۔ اگر خدا نخواستہ تم نے کبھی اس کی بے عزتی کی تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“

اس نے ہسپتال میں اس وقت ارسلان کو کہا تھا جب وہ اپنی عیادت کو آئے حافظ عابد صاحب سے الجھنے لگا تھا۔

’نجانے کیوں چاہتے ہوئے بھی وہ حافظ عابد پر فائز نہ کر سکا۔

لیکن.....!

یہ کیا.....؟

حافظ عابد تو اپنا پہلو تھاے زمین پر گر پڑا تھا۔ اس نے تو گولی نہیں چلائی، پھر یہ گولی کس نے چلائی؟ ارسلان گڑبڑا کر رہ گیا۔ اس کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ شاید چمت پر موجود حافظ عابد کے ساتھیوں نے اسے گولی کھا کر گرتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے دیوانہ وار فائرنگ شروع کر دی تھی۔ وہ راستے میں آنے والی ہر شے کو تباہ کرنے پر تہل گئے تھے۔

”بھاگو.....!“

آچانک ہی کسی طرف سے نکل کر نواز نے اس کا بازو تھاما اور جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا۔

ارسلان جیسے خواب غفلت سے آچانک ہی بیدار ہوا تھا۔ یہ احساس کہ اس سے چند گز پر حافظ عابد کی لاش خون میں لت پت پڑی ہے اس کے لئے بہت جان لیوا تھا۔

یہ وہی حافظ عابد تھا جس نے انگلی پکڑ کر مسجد کا راستہ دکھایا تھا۔ حافظ عابد اس سے عمر میں تو زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اس کے گھر میں حافظ عابد کا احترام بزرگوں کی طرح کیا جاتا تھا۔ اسے قرآن پڑھانے والا محترم نوجوان آج گھناؤنی سیاست کی سمیٹ چڑھ گیا تھا۔ یہ خلش تو اسے مار ڈالے گی۔ اس نے سوچا۔

دین تک نواز اسے قریباً کھینچتا ہوا لایا تھا۔ دونوں کسی طرح اوپر سے ہونے والی فائرنگ سے بچتے بچاتے بمشکل دین تک پہنچے تھے جس کی ڈرائیونگ سیٹ اختر نے سنبھالی تھی۔ گولیوں سے دین چھلنی ہو رہی تھی۔

میں سا گیا۔ جہاں ایک مرتبہ پھر حافظ عابد کی بے گناہ لاش ایک سوال بن کر اس کے لاشعور کو ڈسنے لگی۔

دو تین مرتبہ وہ ہڑبڑا کر اٹھا لیکن عارفہ نے اسے سنبھال لیا۔

○

حافظ عابد کی شکل میں مخالف تنظیم کو اس سال کا سب سے بڑا شہید اور سب سے اہم ”ایشو“ مل گیا تھا۔

انہوں نے حملہ آور تنظیم کے چھ اہم لیڈروں کے نام طرمان کی فہرست میں درج کروا کر یہ الزام بھی دہرایا تھا کہ حملہ آوروں کو ملک صاحب کی سیاسی جماعت کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ اس کا جواب ملک صاحب کی بجائے ان کی سیاسی جماعت کے پراپیگنڈہ سیکرٹری نے شام کو ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں دیا۔ اس پریس کانفرنس میں قریباً ہر قافلہ ذکر اخبار کار پور ٹراور کیمرہ میں موجود تھا اور پریس کانفرنس کے خاتمے پر ”حصہ بقدر جش“ کے مصداق ہر کسی کو اس کی حیثیت کے مطابق نذرانہ دے دیا گیا تھا۔

ملک صاحب اس ملک میں سیاست کرنے کے تمام ”آداب“ سے آگاہ تھے۔ وہ معمولی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر اس مقام تک یونہی نہیں پہنچ گئے تھے۔ پریس سے بہترین تعلقات..... ان کا نصب العین تھا اور اس کی ہر ممکن قیمت وہ ادا کرنے کو تیار رہتے تھے۔

ان کی جماعت کی طرف سے جاری وضاحت اگلے ہی روز قریباً تمام اخبارات کے صفحہ اول پر نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی جب کہ مخالف تنظیم کے مقتول نوجوان کی خبر کہیں اندر کے صفحات میں لگادی گئی تھی۔

یہ تو نوجوانوں کے جذبات کو بھڑکانے والی بات تھی۔

دو پہر تک شہر کی سڑکوں پر ہزاروں طالب علم جمع ہو کر ”عابد شہید کا راستہ ہمارا راستہ“ کے نعرے بلند کرتے پہلے تو آئی جی صاحب کے دفتر کی طرف بڑھے۔ آئی جی صاحب اس سے پہلے ہی وزیر اعلیٰ کے طلب کرنے پر ان کے ہاں ایک ہنگامی اجلاس میں شرکت کرنے تشریف لے چکے تھے۔ یہاں ان لوگوں نے جی بھر کے پولیس اور انتظامیہ کا ماتم کیا۔ جب کسی طرح ان کے

انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ ابھی تک اختر زندہ کیسے رہا؟

دین کا انجن سٹارٹ تھا۔ دونوں بھاگ کر دین میں سوار ہوئے تھے۔ ٹریفک سڑک پر گولیوں کی آواز سے بند ہو چکی تھی۔ سڑک کے دوسری طرف پولیس کے جوان ہاتھوں میں رائفلیں پکڑے ٹرکوں پر سوار محو تماشہ تھے۔ ارسلان کے لئے حیرانگی کی بات تو یہ تھی کہ کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

اختر دین کو دیوانہ وار چلاتا ہوا مطلوبہ جگہ تک لے آیا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق انہیں دین اسی جگہ چھوڑ دینی تھی جہاں وہ پہنچے تھے۔ یہاں سے دو موٹر سائیکلوں پر انہیں الگ الگ راہ فرار اختیار کرنی تھی۔

ایک موٹر سائیکل پر اختر اور ارسلان اور دوسری پر نواز۔ دونوں الگ الگ سمتوں میں فرار ہو رہے تھے۔ اپنا اسلحہ انہوں نے یہیں چھوڑ دیا تھا۔ احتیاطاً پستول اختر نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

موٹر سائیکل کا رخ اسی جنگل کی طرف تھا جہاں وہ اکثر عارفہ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ نواز ان سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا۔

”ویل ڈن مائی ڈیر بوائز ویل ڈن.....! یہاں آتے ہی فون پر انہیں ملک صاحب کی طرف سے اس ”کارنامے“ پر مبارکباد مل گئی۔

شام کی خبروں سے انہیں حافظ عابد کی موت کا علم بھی ہو گیا تھا۔

ارسلان کے دل و دماغ کو اس خبر سے ایک دھچکا سا لگا۔ اسے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں جیسے آہستہ آہستہ کوئی اسے مٹھی میں لے کر دبا رہا ہو۔ اپنی ٹانگوں سے اسے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

ایک بے نام سا چھپتا و اس کی جان کو آ گیا تھا۔

اس نے حافظ عابد پر گولی نہیں چلائی تھی لیکن وہ خود کو اس کا قاتل تصور کر رہا تھا۔

ساری رات عارفہ اور شراب اس کا غم غلط کرتے رہے۔ اس مرتبہ ملک صاحب نے ان کے لئے عارفہ جیسی اور فاحشاؤں کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔

شراب اور شباب کے نشے نے ارسلان کو مدہوش کر دیا تھا۔ جلد ہی وہ نیند کی آغوش

سیاست اور.....

ان کا رخ شہر کے سب سے بڑے اخبار کے دفتر کی طرف تھا۔ دفتر کے سامنے بسیں روک کر انہوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ڈنڈے اور ہاکیاں سنبھالیں اور اخبار کے دفتر میں جا گئے جب کہ ان کے چند ساتھیوں نے دفتر کے باہر کھڑے ہو کر ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ ڈنڈا بردار فورس نے اخبار کے دفتر میں گھس کر ہر قابل ذکر شے کو توڑنا شروع کر دیا۔ اس اثناء میں جو کوئی اخباری ملازم ان کے ہتھے چڑھا اس کی بھی انہوں نے اچھی طرح دھتائی کر دی۔ وہ جنونیوں کی طرح اخبار کے مالکان کو گالیاں بکتے اپنے کام میں مصروف تھے۔ عملے کے ہر قابل ذکر رکن نے ہاتھ روم یا میزوں کے نیچے چھپ کر جان بچائی تھی۔ اخبار والوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ کم از کم اخبار پر حملے کی اطلاع سن کر پولیس ضرور حرکت میں آ جائے گی لیکن آدھ گھنٹے تک پولیس کی طرف سے صرف تسلیاں ہی ملتی رہیں۔

جب حملہ آور اپنا کام مکمل کر کے اطمینان سے فرار ہو گئے تو پولیس کے مستعد جوان ٹرکوں میں سوار موقعہ واردات پر پہنچ گئے۔ شاید وہ اس موقع کے منتظر تھے کہ کب حملہ آور فارغ ہوں اور وہ ان کی جگہ سنبھالیں۔

پولیس فورس کی کمان ایس پی صاحب فرما رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی پولیس کے

طیش دلانے پر بھی صورت حال جوں کی توں رہی تو جلوس کی طرف سے پولیس پر پتھراؤ شروع ہو گیا۔ جواب میں مجبوراً پولیس نے اشک آدرگس استعمال کی۔ جب معاملہ اس پر بھی کنٹرول نہ ہوا تو ہوائی فائرنگ کی نوبت آ گئی۔

عین ان لمحات میں جب پولیس اور طلباء کے درمیان شہر کی سڑکوں پر آنکھ بھولی ہو رہی تھی یونیورسٹی اور کالج کی یونیوں کی چار بسوں پر سوار کچھ طلباء اپنے مشن پر الگ سے چل پڑے تھے۔



یہ بھی کہا تھا کہ سیاست میں تشدد کا جو سیلاب اٹھا چلا آ رہا ہے اس کی واحد وجہ اس جماعت کے لوگوں کی غیر اخلاقی اور غیر قانونی کارروائیاں ہیں۔

ملک صاحب نے ہسپتال میں داخل اس اخبار کے چاروں زخمی کارکنوں کی خود عیادت کی تھی اور چاروں کے لئے اپنی جیب سے دو لاکھ روپے کی امداد کا اعلان بھی کیا تھا۔ ان کے ایسے ہی ”انقلابی اقدامات“ نے کارکنوں کے دل موہ لئے۔ اگر کسی کے دل میں ملک صاحب کے خلاف کچھ بغض تھا تو وہ بھی اب ختم ہو چکا تھا۔

حملہ آوروں نے جاتے ہوئے اخبار کی انتظامیہ کو وارنٹک دے دی تھی کہ اگر انہوں نے آئندہ بھی اپنی اصلاح نہ کی تو وہ اس سے بھی زیادہ سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہوں گے۔ شہر کے دوسرے اخبارات کے ملازمین اور مالکان کو فون کر کے انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ اس ایک مثال سے ہی سبق حاصل کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہوگا بصورت دیگر ان کے ساتھ بھی یہی تاریخ دہرائی جاسکتی ہے۔

O

اخبار کے مالک کی اشک شونی کے لئے صوبے کی متعدد شخصیات گاڑیوں کے جلوسوں میں آجاری تھیں لیکن کوئی بھی حملہ آوروں کو فوری سزا دینے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ اخبار کے مالک نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ سیاسی لوگ ہیں اور مفادات کی جنگ میں کسی تیسرے فریق کا بوجھ اٹھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ کسی نہ کسی سطح پر مفادات پر سمجھوتہ کر سکتے تھے اور اخبار کی حیثیت گندی سیاست کے اس بازار میں نہ ہونے کے برابر تھی۔

اگلے روز اخبار کے مالک صاحب اپنے عملے کے سینئر اراکان سمیت اس سیاسی تنظیم کے دفتر تشریف لے جا رہے تھے جس کی پروردہ طلباء تنظیم نے ان کا یہ حال کیا تھا۔ سیاسی تنظیم کے لیڈروں نے اخبار کے مالک کے خوب لئے لئے اور اسے وارنٹک دینے کے انداز میں کہا کہ اگر انہوں نے خبروں میں اپنی ایک طرفہ پالیسی ترک نہ کی تو طلباء مشتعل ہو کر کچھ بھی کر گزریں گے اور اس صورت میں وہ ان کے لئے کچھ نہیں کر پائیں گے۔

انہوں نے بے چارے مالک سے اس طرح سلوک کیا تھا جیسے یہ ساری تباہی اس کے اپنے ہاتھوں انجام پائی ہو۔ مالک صاحب بھی بڑے کانیاں آدمی تھے۔ وہ ہنگامی بنے زخمی لیکن

جوانوں کو عمارت گھیرے میں لینے کا حکم دیا۔ پولیس کے مسلح دستوں نے تباہ شدہ عمارت کو گھیرے میں لے کر اس میں چھپے ہوئے خوفزدہ اور زخمی لوگوں کو مقید کر دیا۔

اخبار کے مالک خوش قسمتی سے اپنے دولت خانے پر تشریف فرما تھے۔ جب ان کو اس واردات کی خبر کی گئی تو وہ بھی بھاگ بھاگ دفتر پہنچے۔ ان کے چیخنے چلانے پر پولیس والوں نے بمشکل زخمیوں کو ہسپتال پہنچانے کی اجازت دی ورنہ وہ تو موقعہ واردات سے کسی بھی ”کارآمد کلیو“ کو ادھر ادھر کرنے کی اجازت دینے پر تیار ہی نہیں ہو رہے تھے۔

”اب آپ لوگ کیا جھک مارنے آئے ہیں؟ حملہ آور تو اپنا کام کر کے چلے گئے.....!“ اخبار کے مالک نے ایس پی کے منہ کے سامنے ہاتھ نہ جاتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے جناب! ٹھیک ہے آپ بڑے لوگ ہیں۔ آپ کے تعلقات اعلیٰ حکام سے رہے ہوں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ سرکاری ملازمین کی بے عزتی شروع کر دیں۔“ ایس پی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ دبے والا نہیں ہے۔

اخبار کے مالک نے ”چھوٹے ملازم“ کے منہ لگنا پسند نہیں کیا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

تھوڑی دیر میں پولیس اور اعلیٰ حکام بھی موقعہ واردات پر پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ اس دوران پولیس نے حملہ آوروں کے ڈنڈوں اور ہاکیوں سے بچ جانے والے اخباری کارکنوں کی اس طرح انگوٹری شروع کر دی کہ گویا یہ کارنامہ انہوں نے ہی انجام دیا۔ اخباری ملازمین نے اس بے ہودہ رویے کے خلاف بطور احتجاج پولیس کو بیان دینے سے انکار کر دیا تھا۔

”جناب والا! جب آپ پولیس سے تعاون نہیں کریں گے تو ہم ملازموں کو گرفتار کیسے کر سکیں گے.....!“ ایس پی صاحب نے ملازمین کے اس رویے پر شاکی لہجے میں اخبار کے مالک صاحب سے کہا۔

اخبار کے مالک کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کا ٹینٹا دبا دے۔ وہ لوگ بجائے ہمدردی کے التان کے زخموں پر نمک چھڑک رہے تھے۔ بس ایک ملک صاحب تھے جنہوں نے دل و جان سے اس حادثے پر صدمے کا اظہار کیا تھا اور ایک ایک کارکن کے پاس جا کر اپنے دلی رنج و غم کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی حملہ آور تنظیم کے خلاف ڈٹ کر بیان دیا تھا اور

ہو۔“ والدہ نے روتے ہوئے سینکڑوں عورتوں کی موجودگی میں زندگی کے سب سے بڑے اور جان لیوا فیصلے کا اعلان کر دیا۔

جس روز اخبارات میں لاطلفی کا یہ اشتہار شائع ہوا۔ ہمارے ہاں بھی۔ وہ خود کو ضمیر کی ملامت سے کبھی چھٹکارہ نہ دلا سکی۔ ارسلان کی تباہی میں اسے کہیں نہ کہیں اپنا ہاتھ بھی نظر آتا تھا۔

○

ارسلان ملک صاحب کی طرف سے فراہم کردہ فلیٹ میں پہنچا ہی تھا جب اس نے دروازے پر مانوس سی آہٹ سنی اور ہمارا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

”ارسلان خدا کے لئے اس راستے سے ہٹ جاؤ۔ تم ملک کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہو وہ تمہیں تباہ کر دے گا۔ اب بھی وقت ہے ارسلان تم چاہو تو اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے دوبارہ شریفانہ زندگی میں لوٹ سکتے ہو۔“

اس نے رو دینے والی آواز میں ارسلان سے کہا۔

”مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہمارا کبر شیر وانی۔ میں کوئی راستے میں گر پڑا پانچ نہیں ہوں کہ لوگ مجھ پر ترس کھاتے پڑیں..... اور جب میرے والدین نے ہی مجھے عاق کر دیا ہے۔ محض ایک غلط اطلاع کی بنیاد پر تو تم کون ہوتی ہو مجھ سے ہمدردی جتانے والی.....! جاؤ چلی جاؤ.....! مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں نے زندگی کا جو راستہ چنا ہے، خوب سوچ سمجھ کر چنا ہے۔ میں کوئی بچ نہیں ہوں، نہ مجھے انگلی پکڑ کر چلانے کی کوشش کرنا..... اور یہ جو تم ہر قدم پر مجھے میری کم مائیگی کا احساس دلاتی رہتی ہو میں اس رویے کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ نہیں چاہئے مجھے یہ جھوٹی ہمدردی..... اگر تمہیں اتنی ہی محبت تھی مجھ سے تو میری محبت کو ٹھکرایا کیوں تھا؟ کیا سمجھا تھا تم نے مجھے اور کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو.....؟“ ابھی تک شراب کا نشہ نہیں لہڑا تھا۔

”مجھے سمجھنے کی کوشش کرو ارسلان۔ خدا را مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تمہاری بہت عزت کرتی ہوں۔ میں تمہیں تباہ ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے ارسلان۔ میں مرجاؤں گی..... مرجاؤں گی.....“ وہ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگی۔

لیکن.....!

وہ پتھر کا بت بنا اسے دیکھتا رہا.....!!

مجبور شیر کی طرح سر جھکائے سب کچھ سنتے رہے۔ بلا آخر فریقین کے درمیان طے پایا کہ آئندہ اخبار حملہ آور پارٹی کے کارکنوں کی خبریں بھی نمایاں شائع کرے گا اور حملہ کی اس خبر کو زیادہ نہیں اچھالے گا۔

سیاسی جماعت کے گرگ جہان دیدہ نے اخبار کے مالک کی آمد کی خبر فوراً ہی تمام اخبارات کو جاری کر دی تھی جس میں اخبار مالک کی طرف سے اپنے سابقہ رویے پر ”معذرت کا اظہار“ کرنے کا تذکرہ بھی موجود تھا۔ یہ خبر متاثرہ اخبار کے کاروباری حریف نے مع تصاویر اپنے اگلے روز کی اشاعت میں صفحہ اول پر شائع کرتے ہوئے ادارتی نوٹ میں اسے ”خوش آمد قدم“ قرار دیتے ہوئے اس امر کی ضرورت پر قارئین کو دھیان دلایا تھا کہ سیاسی جماعتوں کے قائدین اور اخبارات کے درمیان ”خوشگوار تعلقات“ سے امن و امان کی صورت حال کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

متاثرہ اخبار کا مالک حالات کی اس ستم ظریفی پر اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی نے جھوٹے بھینچوں کے سامنے پھینک دیا ہو۔

○

ارسلان کی ضمانت قبل از گرفتاری ملک صاحب کے کارندوں نے احتیاطاً کروائی تھی لیکن ارسلان کے لئے چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ اس کا نام مخالف تنظیم نے طرمان کی فہرست میں نہیں لکھوایا تھا حالانکہ اسے سب نے پہچانا تھا اور یوں بھی اس نے اب خاصی شہرت کمائی تھی۔ یہ بات اس کے لئے حیران کن تھی۔

حافظ عابد کا جنازہ اٹھا تو ایک کھرام مچ گیا۔ ارسلان کا نام ایف آئی آر میں نہ سبھی مگر اس کے والدین تک یہ بات پہنچ چکی تھی کہ حملہ آوروں کی کمان ان کا صاحبزادہ ہی کر رہا تھا۔

بوڑھے اور معزز والدین کے لئے یہ لرزادینے والی اطلاع تھی۔ اس حادثے نے ان کے اوسان ہی خطا کر دیئے تھے۔

”ارسلان میں تمہیں دودھ کی دھاریں نہیں بخشوں گی۔ تم پر خدا کا عذاب ٹوٹے، تم نے حافظ قرآن کو مار ڈالا۔ خبردار! کبھی اس طرف کا رخ نہ کرنا۔ آج سے تم ہمارے لئے مر گئے

خدا نخواستہ تمہارے قتل کی صورت میں ان پر شک کرنے کا جواز ہی ختم ہو جاتا ہے۔“

یہ لرزادینے والی حقیقت تھی جس سے وہ ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی اس تک مخالف تنظیم کی دارنگ پہنچ چکی تھی کہ وہ اپنی اور اس کی دشمنی میں کسی تیسرے کو لا کر کھیل کا مزہ کر کرنا نہیں چاہتے۔

وہ قدم قدم پر ملک صاحب کا دست نگر تھا۔ اگر اس کے سر سے دست شفقت اٹھا لیتا تو وہ خارش زدہ کتے کی موت مارا جاتا اور کوئی اس کی لاش بھی وصول کرنے کی جرأت نہ کرتا۔

اور.....!

دوسری طرف ملک صاحب اس لڑکی ہما اکبر شیروانی کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے جس نے عین انتخابات کے موقع پر تنظیم کو دھوکہ دیا تھا۔ انہوں نے باقاعدہ اعلان کروا کر ہما اکبر شیروانی کو انقلابی طلباء فیڈریشن سے خارج کر دیا تھا۔

”اگر انہیں علم ہو گیا کہ وہ ہما اکبر سے ابھی تک ملتا ہے تو.....؟“ یہ سوچ ہی اس کے لئے بہت اذیت ناک تھی۔

”ہما میں پھر کبھی اس مسئلے پر بات کروں گا۔“ اس نے ہما کو ملک کے چچے جاوید کی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔

”مجھے ابھی اور اسی وقت اپنی بات کا جواب چاہئے۔“ ہما کے لہجے میں چھپی سنجیدگی اور چٹنگی نے ارسلان کے ہاتھ پیر بھلا دیئے تھے۔

”میں نے کہا تھا کہ ابھی میں بات نہیں کر سکتا۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”ارسلان اگر تم نے کتے کی موت مرنے کی ٹھان ہی لی ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ خدا

حافظ!“

وہ دروازہ زور سے بند کر کے باہر نکل گئی۔

”کمال ہے بھی!“ جاوید نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”آئی تھی بے چاری مجھ سے مدد مانگنے۔ شاید کوئی نیا بلاک کھڑا کرنے جا رہی ہے۔

بڑی خطرناک عورت ہے یا ر میں نے تو کہہ دیا کہ میں کم از کم اس کے چنگل میں پھنسنے کو تیار نہیں

ہوں۔“

ہمدردی کا ایک لفظ بھی ہما اکبر شیروانی کے لئے اس کے پتھر لیے ہونٹوں سے ادا نہ ہوا۔ شاید ہما کے رونے سے اس کی کسی حس کی تسکین ہو رہی تھی۔

کتنا اذیت پسند ہو گیا تھا وہ.....!

ہما نے خود ہی ضبط کیا، خود کو نارل کیا۔ اپنے آنسو پونچھے اور ارسلان کی طرف دیکھ کر انتہائی سنجیدگی اور حوصلے سے کہا..... ”ارسلان تم مجھ سے شادی کرو گے؟“

ارسلان کے لئے یہ سوال ہی چونکا دینے والا تھا۔ اسے اپنا نشہ اترتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ تونسانے میں آ گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ سوال کا کوئی جواب دے اچانک ہی دروازہ پر آہٹ ہوئی اور جاوید اندر آ گیا۔

”اوہو! بھی میں غلط ایڈریس پر تو نہیں پہنچ گیا.....!“ اس نے ہما کی طرف دیکھ کر طنز یہ لہجے میں کہا۔

”ارسلان مجھے اپنے سوال کا جواب چاہئے.....!“ ہما نے جاوید کو نظر انداز کرتے ہوئے ارسلان کی آنکھوں میں جھانکا۔

ارسلان کو صورت حال نے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے والدین اسے عاق کر چکے تھے۔ کئی مقدمات میں وہ پولیس کو مطلوب تھا اور ضمانت پر رہا تھا۔ اس کا واحد سہارا ان حالات میں جب کہ وہ مخالف تنظیم کی ”ہٹ لسٹ“ پر بھی آچکا ہو، سوائے ملک صاحب کے اور کون تھا۔

جب اسے خبر ملی تھی کہ حملہ آوروں میں اس کا نام درج نہیں کروایا گیا تو ملک صاحب نے انتہائی رازدارانہ لہجے میں کہا تھا.....!

”برخوردار! ذرا ہوشیار رہا کرو۔ خدا نہ کرے دشمن کے عزائم خطرناک ہیں۔ تمہارا نام

ایف آئی آر میں نہ دے کر ایک طرح سے انہوں نے تمہارے متعلق اپنے بھیا تک ارادے کا

سگنل خود ہی دے دیا ہے۔ وہ لوگ اب حافظ عابد کے خون کا بدلہ تمہیں مار کر لینا چاہیں گے اور

جب انہوں نے حملہ آوروں میں تمہارا نام ہی پولیس کو نہیں دیا تو اپنی دانست میں یہی سوچا ہے کہ

ارسلان کو بھی حالات نے سیاست سکھا دی تھی۔ اس نے بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے جاوید کے سامنے اپنی صفائی پیش کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جاوید کے ذریعے بات اور طرح ملک صاحب کو پہنچے حالانکہ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس حادثے نے اس پر کیا ستم ڈھایا ہے۔

اس کو اپنے اعصاب تو ختمے محسوس ہو رہے تھے۔

”دیکھو یار! تم اپنے بھائی ہو۔ میں تمہیں صاف صاف بتا دوں کہ ملک صاحب اس کو اب بالکل پسند نہیں کرتے اور جس کسی سے یہ ملے گی اس کے خلاف بھی ان کے دل میں بدگمانی پیدا ہوگی.....!“ جاوید نے لگی پٹی رکھے بغیر کہہ دیا۔

”جاوید! مجھے اس بات کا علم ہے اور تم بھی اس کا خیال رکھنا کہ میرے متعلق ملک صاحب کو کوئی غلط اطلاع نہیں پہنچنی چاہئے۔ میری زندگی تو داؤ پر لگی ہی ہے اپنا برا چاہنے والوں کو میں پھولوں کے ہار نہیں ڈالوں گا۔ یہ تو ظاہر ہے.....!“

اس کے لہجے میں چھپی دھمکی کا ادراک جاوید کو ہو گیا تھا۔

”یار لغت بھیجو! مجھے کیا ضرورت ہے۔ ہم تو یاروں کے یار ہیں۔“ اس نے بڑی میسنی ہنسی ہنستے ہوئے ارسلان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اس کے بعد دونوں اگلے روز شام کو ہونے والی مینگ میں زیر بحث آنے والے مسائل پر بحث کرنے لگے۔

○

جاوید کی روانگی کے بعد سے ایک مستقل پچھتاوا اس کی جان کو آ گیا تھا۔ جاوید کے جاتے ہی وہ بھاگم بھاگم نزدیکی پی سی او تک گیا۔ وہ فون پر اپنی مجبوری کو ہما کے گوش گزار کر کے اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا.....! وہ ہما کو یہ کہنے جا رہا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ ہمس سے شادی کر کے اس ماحول سے جان چھڑانے کے لئے تیار ہے۔ اس نے سوچا تھا جب ہما کو بتائے گا کہ وہ آج تک اس کے منہ سے یہی الفاظ سننے کے لئے ترس رہا تھا تو وہ کتنی خوش ہوگی..... وہ اسے معاف کر کے اس کے تمام گناہوں سمیت اسے سینے سے لگا لے گی۔

لیکن.....!

قسمت اس پر اتنی مہربان کب رہی تھی جواب اس کو زندگی کی خوشیوں سے اپنا حصہ

وصول کرنے کا حق مل جاتا۔ اسے تو حالات نے ستم ڈھانے کے لئے جانے کب سے منتخب کر لیا تھا۔

قہر کی دیوی کو نجانے اس کی کون سی ادا بھاگتی تھی کہ اب وہ اپنا دست ستم اس کے سر سے اٹھانے پر تیار ہی نہ ہوتی تھی۔

”بی بی جی گھر پر نہیں ہیں!“ دوسری طرف سے غیر مانوس سی آواز سنائی دی۔

رات تک وہ دیوانہ وار فون کرتا رہا لیکن ہر دفعہ اسے یہی جواب ملا۔ رات کو ہما کے نوکر نے جو ارسلان کو جانتا تھا اطلاع دی کہ وہ اپنے والدین کو ملنے گئی ہے جو ملک کے دوسرے بڑے شہر میں رہتے تھے۔ بہت کوشش کے باوجود اسے ان کا فون نمبر نہ مل سکا۔ پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو رہا کہ ہما کی واپسی پر اس سے معافی مانگ کر اسے منالے گا۔

اس دوران وہ ملک صاحب کے چلائے چکروں میں پھنسا رہا۔ اپنی جان کی حفاظت کے لئے وہ یوں بھی ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھاتا تھا۔

یونیورسٹی تو اس کا جانا برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ سات آٹھ روز بعد جب وہ ایک دن اتمام حجت کے لئے یونیورسٹی گیا تو اسے علم ہوا کہ ہما نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔ اسے شاید امریکہ کے کسی کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ اگلے روز وہ یہاں اپنے دوستوں سے تھوڑی دیر کے لئے الوداعی ملاقات کرنے آئی تھی.....!

اس کے ہم جماعتوں نے بتایا کہ ہما اب پہلے والی ہما اکبر شیروانی نظر نہیں آتی تھی۔

”یار وہ تو بالکل بدلی ہوئی لڑکی تھی۔ ایک دم خاموش۔ جیسے کسی نے اس کا سب کچھ چھین لیا۔“

ایک ہم جماعت نے بڑی ہمدردی سے اس کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں تمہارا پوچھ رہی تھی کہ تم کبھی یونیورسٹی آتے بھی ہو یا نہیں؟“ ہم نے کہا ”بی بی شہزادہ ہے شہزادہ۔ یہ کالج یونیورسٹیاں تو ہم جیسے..... فقیروں کے لئے بنی ہیں۔ ارسلان جیسے شہزادوں کے فشی ضرور یہاں پڑھنے آتے ہیں انہیں کیا ضرورت ہے بھی اپنی انرجی ضائع کرنے کی؟ ڈگری تو چل کر ان کے قدموں کو بوسہ دیتی ہے۔ امتحان دینے کو ہم کیا کم ہیں!“

جانے اس کا دوست کیا کیا طرز کے نشتر چلاتا رہا لیکن ارسلان یہاں تھا ہی کب؟

اس کی اندھیری زندگی سے امید کی کرن بھی رخصت ہو گئی تھی۔ اب وہ تھا اور ظلمتوں میں گم راستے..... جن پر اس نے اندھوں کی طرف ٹاک ٹوئیاں مارتے ہوئے حیات کے اس سفر کو پائنا تھا۔

”کیسے چل سکوں گا میں؟ تم نے یہ کیا کیا؟ تم تو بہت ہمت والی تھیں۔ تم تو مجھے ہمت دلا کر گناہوں کی اس دلدل سے باہر نکالنے جا رہی تھیں..... اب میرا کیا ہوگا؟ کیا ہوگا میرا.....؟“

وہ پاگلوں کی طرح خود سے باتیں کرتا رہا۔

اپنے کسی سوال کا جواب اب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ حالات کے آکٹوپس کے شکار میں جکڑ چکا تھا۔ کسی ہزار ہاتھ پاؤں والی بلا نے اسے دبوچ لیا تھا اور وہ مرضی سے اپنے جسم کا کوئی بھی عضو ہلانے پر قادر نہیں رہا تھا۔

اب اسے بے بسی سے اپنی آنکھوں کے ساتھ اپنی بربادی کا تماشا دیکھنا تھا۔

جس سمت کا سفر اس نے اختیار کیا تھا وہاں قدم قدم پر مصائب و آلام کی دیوایاں بانہیں پھیلائے اس کی منتظر تھیں۔

وہ بہت بد قسمت تھا!

خوش بختی نے دے قدموں اس کے دروازے پر آہٹ نہیں کی تھی.....!!

اس نے تو دھکے دے دے کر خوش نصیبی کو اپنے گھر سے نکالا تھا اور ایسا نکالا تھا کہ اب اس نے دیس نکالا ہی لے لیا تھا۔

کیا کروں؟

کدھر جاؤں؟

کس کے پاس جاؤں؟

اس نے خود سے پوچھا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اختر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اختر کل ہی ضمانت پر رہا ہو کر گھر آیا تھا۔



وہ تو کسی اور ہی دنیا میں کھو گیا تھا.....!

جیسے اس اطلاع نے اس کا دل کچل ڈالا ہو۔ کچھ سوچتا وہ چپ چاپ موٹر سائیکل شینڈ کی طرف آیا اور اب وہ تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر موٹر سائیکل اڑاتا ہوا ہمارے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

”سر جی! وہ تو واپس ہی نہیں آئیں۔ ایسی گئیں کہ دوبارہ پلٹ کر ادھر دیکھا بھی نہیں۔

پرسوں تھوڑی دیر کے لئے آئی تھیں۔ مجھے اور خانساں کو خاصے پیسے دیئے اور کہا کہ وہ باہر جا رہی ہیں۔ اب لمبے عرصے تک نہیں لوٹیں گی۔ سر جی! بہت اداس تھیں بی بی جی۔ کار سے اتر کر وہ چند منٹ کے لئے اینکسی میں گئیں پھر روتی ہوئی کار میں بیٹھ کر چلی گئی.....! اب تو وہ شاید ملک سے باہر ہی جا چکی ہوں گی.....!“ باغ میں کام کرنے والے مالی نے بڑے دکھی لہجے میں اسے بتایا۔

ارسلان کے دل پر الم کا پہاڑ آن گرا..... اس نے بڑی ہمت سے اپنی ٹکھری تو اٹائیوں کو جمع کیا اور لرزتی ہوئی آواز میں مالی سے اس کے والدین کا فون نمبر دریافت کیا۔

”ہم تو ان پڑھ لوگ ہیں بابو جی! کیا بتا سکتے ہیں.....! مالی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

بعد از خرابی بسیار اس نے ہمارے گھر کا فون رات تک حاصل کر ہی لیا اور جب رات گئے اس نے ملک کے اس بڑے شہر میں مقامی پی سی او سے فون کر کے ٹیک کال پر ہمارے بات کرنا چاہی تو دوسری طرف کسی سیکرٹری قسم کی چیز نے جواب دیا..... ”جناب وہ تو کل کی لندن جا چکی ہیں!“

جب اس نے ہمارے والدین سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو دوسری طرف سے ڈانٹ کر فون بند کر دیا گیا۔

○

ارسلان ٹوٹ کر رہ گیا.....!

وہ کئی کلکوں میں بکھر گیا تھا۔ اپنے منتشر وجود اور دل و دماغ کے سارے ٹکڑے سمیٹنا اسے اپنے بس سے باہر دکھائی دے رہا تھا۔ ٹیلی فون اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا تھا۔ بمشکل دیوار کے سہارے وہ لگ کر بیٹھا اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

لوگوں کو منہ نہیں لگایا کرتے۔“

جہانمیدہ نائیکہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ارسلان کو تول لیا تھا۔

نازنین نے اپنے ناز و ادا کے وہ کمالات دکھائے کہ ارسلان مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس نے ثابت کر دکھایا تھا کہ وہ عارفہ کی طرح کوئی معمولی جسم فروش لڑکی نہیں ہے۔

یہاں آ کر ارسلان کو شدت سے احساس ہوا تھا کہ آج تک وہ جھک ہی مارتا رہا تھا..... اصل میں تو نازنین ہی وہ لڑکی ہے جو اس کے دکھوں کا مداوا کر سکتی ہے۔

پہلی ہی ملاقات میں وہ نازنین کے نازخروں پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات پر نازنین کو اپنا لینے کا عہد کر لیا تھا، خواہ اس کی کچھ ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔

اس بات کا احساس اسے نہ ہوسکا کہ پہلی ہی رات دو ہزار اس نے نازنین کی نذر کر دیئے تھے اور اس کے عوض حاصل کی تھی چند گھنٹوں کی رفاقت۔

صبح کی اذان ہو رہی تھی جب دونوں گھر لوٹے۔ گھر لوٹتے ہوئے اسے پھر اپنے کھوکھلے پن کا احساس ہونے لگا تھا۔ اسے پھر ہایا آگئی تھی۔

کوئی ایسی بات اس میں ضرورت تھی جس نے ایک مرتبہ تو ارسلان کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کو ہمارا قرب کبھی حاصل نہیں رہا تھا، حالانکہ ہمارا اپنی شرافت کا بھی کوئی دعویٰ نہیں تھا لیکن نجانے وہ کیوں چاہتی تھی کہ ارسلان اپنی اس دنیا میں لوٹ جائے جہاں سے وہ بھٹک کر ادھر آ نکلا تھا۔

دو پہر تک وہ لمبی تان کر سوتا رہا.....!

نیند میں بھی ہمارا کا اداس اور سوالیہ چہرہ اس کے لاشعور پر مسلط رہا۔

○

شراب اس کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی.....!

اسے روزانہ شراب کی طلب محسوس ہونے لگتی تھی۔ نازنین کے ہاں اس کا آنا جانا معمول کی بات بن گئی تھی۔ جتنے پیسے اسے ملک صاحب کی طرف سے ملتے تھے وہ نازنین کے ہاں لٹا آتا تھا۔

اسی دوران ملک کے حکم پر اس نے چار پانچ مرتبہ مخالف تنظیم کے مختلف جلسے جلوسوں پر

فریب نگری

”خیریت.....؟“ اس نے رات کے بارہ بجے ارسلان کو اپنے دروازے پر کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

”میں بہت دھبی ہو گیا ہوں اختر! چلو عارفہ کے ہاں چلتے ہیں۔“ اس نے غیر ارادی طور پر ہی عارفہ کا نام لے لیا تھا۔

”لغت بھیجو اس پر۔ پیارے ہم تمہارا غم غلط نہیں کروائیں گے تو کون کروائے گا۔ آؤ آج تمہیں ایسے جہان سے آشنائی کروا تا ہوں کہ پھر سب کچھ بھول کر وہیں کے ہو رہو گے۔“ اختر نے بے حیائی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

اور وہ اس کو شراب و شباب کے اس نئے جہان میں لے آیا جہاں ایک مرتبہ آ کر کوئی قسمت والا ہی بھرے ہاتھوں لوٹتا ہے۔

نازنین تھا اس طوائف کا نام جس کے کوٹھے پر اختر اسے لے کر آیا تھا۔

”میرا دوست بہت اداس ہے، بہت بڑا آدمی ہے یہ۔ اس کا بہت خیال رکھنا۔“

اس نے بوڑھی نائیکہ کی طرف دیکھ کر آنکھ دبا دی۔

”حضور! یہ خاندانی طوائفوں کا کوشا ہے۔ یہاں بڑے لوگ ہی آتے ہیں، ہم چھوٹے

ارسلان کی حیثیت گینگ لیڈر کی تھی..... اس کے ساتھی چھوٹی موٹی وارداتیں کرتے رہتے تھے۔ کبھی کسی راہ چلتی خاتون کا پرس چھین لیا۔ کبھی کسی دیگن والے کو ڈرا دھمکا کر پیسے چھین لئے۔ کبھی کسی دکاندار کو دھمکیاں دے کر وہاں ہاتھ مار لیا۔

لیکن.....!

ارسلان ایسی چھوٹی موٹی اور گھٹیا حرکتوں کا قائل نہیں تھا۔ وہ تو کوئی لمبا ہاتھ مارنے کا قائل تھا جس کی ضرورت بھی آج کل بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

نازنین کی ماں کے تھامے روز بروز بڑھتے جا رہے تھے اور ملک صاحب کی طرف سے اتنی زیادہ رقم بھی نہیں ملتی تھی کہ وہ اس کی ماں کا منہ بند کر سکے۔ اس روز جب وہ دن میں ایک دوست کی کار پر نازنین کے ہاں گیا تو اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی نازنین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟“ وہ گھبرا کر رہ گیا تھا۔

”ارسلان تم اس بازار گناہ کے اصول کبھی نہیں سمجھ پاؤ گے۔ تم بہت بھولے ہو ارسلان۔ تم کچھ نہیں جانتے۔“ اس نے ٹسوے بہاتے ہوئے کہا۔

”اوہ نازنین پہیلیاں نہ بھجواؤ۔ کچھ بتاؤ گی بھی؟“ ارسلان نے اس کو اپنی سمت کھینچتے ہوئے کہا۔

”ارسلان ہماری دنیا کے کچھ اصول ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے جس کے لئے میری ماں نے مجھے پال پوس کر جواں کیا تھا۔ اب وہ میری قیمت وصول کرنا چاہتی ہے ارسلان!“

نازنین نے روتے ہوئے اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا۔

”یہ ناممکن ہے، میں تمہاری ماں کو.....!“

”نہ ارسلان خدا کے لئے ایسی بات نہ کرو۔ کبھی بھول کر بھی ایسا خیال دل میں نہ لانا..... ارسلان تمہارے لئے یہ ممکن نہیں ہوگا۔ تم نہیں جانتے کہ ملک صاحب تک رسائی میری ماں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ تمہارے اور ان کے تعلقات کی نوعیت کچھ مختلف ہو سکتی ہے لیکن میری ماں سے بگاڑ کو وہ اپنے ہاتھوں اپنی قبر نہیں کھودیں گے..... جب انہیں کسی لڑکی کی ضرورت ہوتی

فارنگ کی تھی۔

جس قسم کی تفتیش کا سامنا اس نے مخالف تنظیم کے عقوبت خانے میں گیمیا تھا، اس قسم کی تفتیش سے وہ مخالفوں کو بھی گزرا چکا تھا۔ ایسا ہی ایک عقوبت خانہ ان لوگوں نے کھول رکھا تھا.....!!

جو مہر اس کے جسم پر لگائی گئی تھی.....!

وہ مہر اس نے اپنے بیشتر مخالفین کے جسموں پر لگادی تھی۔ کبھی وہ اس اذیت کے تصور سے بھی لرزاں تھا جو اس کو دی گئی تھی۔ اب وہی اذیت دشمنوں کو پہنچا کر وہ لذت محسوس کرتا تھا۔

اس کا نام مخالفین میں دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ اب ملک صاحب نے اس کو جیپ لے دی تھی اور جب بھی وہ گھر سے نکلتا مسلح نوجوان اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ لوگ شہر کی ماڈرن آبادیوں میں دندناتے پھرتے..... خواتین کو تنگ کرنا ان کا معمول تھا لیکن کوئی آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

پولیس والے ان کی شکل دیکھتے ہی اپنی شکل دوسری طرف پھیر لیتے۔ جیسے انہوں نے انہیں کبھی دیکھا ہی نہیں۔

کبھی کبھی تو اس صورت حال پر ارسلان کو ہنسی آ جاتی تھی۔

اخبارات ان کے خلاف خبر چھاپنے سے احتراز برتتے تھے۔ پولیس والے ان کے نہ لگنا پسند نہیں کرتے تھے۔

انتظامیہ ان جیسے نوجوانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے ان کے سامنے دم ہلاتی رہتی تھی کیونکہ ان کی رسائی اقتدار کے ایوانوں تک تھی، ان لوگوں تک تھی جن کے قلم سے نکل چند سطریں ملازمین کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیتیں کبھی آسمان سے زمین پر ٹپکتی تھیں۔

سیاست دان اپنے جلوسوں کی رونق بڑھانے اور مخالفین کے جلسوں کی رونق گھٹانے کے لئے ان کے دست بازو کے محتاج تھے۔

پھر انہیں لگام کون دیتا؟

کس کو پڑی تھی جو اپنی عزت اور نوکری خطرے میں ڈال کر محض قانون کی بالادستی کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈالتا۔

یہی سوچ کر اس نے اپنی بیٹی کے ساتھ لمبا ہاتھ مارنے کا پلان تیار کیا تھا اور ارسلان کے جانے کے بعد وہ اپنی بیٹی کا سرمند دیوانہ وار چوم رہی تھی جس نے اپنے اسلاف کی روایات کا بھرم قائم رکھا تھا اور کمال ہوشیاری سے ارسلان کے سامنے ”ملک صاحب“ کا پتہ کھیل گئی تھی۔ اس طرح انہوں نے ارسلان کو یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ اگر اس نے کوئی ”ایڈ ونچر“ کرنے کی کوشش کی تو وہی ملک جس کا وہ پروردہ ہے اس کے خون کا پیا سا ہو جائے گا۔

یوں بھی ارسلان نے جس درخت پر پناہ لے رکھی تھی اس کی جڑوں پر کھپاڑا چلانے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا.....!

○

ارسلان یہاں سے سیدھا اختر کے پاس پہنچا تھا۔

”یار کچھ کرنا ہی ہوگا۔ تم نہیں جانتے یہ لوگ صرف پیسے کی زبان سمجھتے ہیں۔“ اختر نے اس کی بات سن کر کہا۔

”لیکن ملک صاحب سے اتنی رقم کیسے مانگی جائے؟“ ارسلان نے کہا۔

”نہ نہ یہ غضب نہ کرنا۔ ملک صاحب کو اس بات کی ہوا نہیں لگنی چاہئے کہ تم نازنین کے کوٹھے پر جاتے ہو۔ انہیں یہ تو علم ہے کہ تم اس بازار میں جاتے ہو لیکن میں نے اس بات کی ہوا تک نہیں لگنے دی کہ تم..... نازنین کے پاس جاتے ہو..... اور ہاں جاوید سے خبردار رہنا۔ وہ آج کل ملک صاحب کا کچھ زیادہ ہی چہیتا ہو رہا ہے۔“

اختر نے اس کو خبردار کیا اس نے آخری فقرہ جان بوجھ کر ادا کیا تھا۔

واقعی جاوید اس کا قریب بن رہا تھا۔ کبھی وہ ملک صاحب کا سب سے زیادہ چہیتا تھا اور پیسوں کی تقسیم اسی کے ذریعے ہوتی تھی لیکن اب آہستہ آہستہ اپنی چرب زبانی کے سہارے جاوید نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا اور بہت سے کام جو پہلے اختر کے ہاتھوں انجام پاتے تھے اب جاوید کے ہاتھوں انجام پانے لگے تھے۔ خاص طور سے مختلف مواقعوں پر عورتوں کا حصول اور شراب کی خریداری کا ذمہ تو ملک صاحب نے مستقل جاوید کو سونپ دیا تھا۔

اختر کے شاطر ذہن نے ایک تیر سے دو شکار کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ارسلان بہر صورت اس کی ہاں میں ہاں ملائے گا۔

ہے تو میری ماں ہی کے مستقل گاہک ہیں۔ ارسلان! مجھے یہ بات تمہیں بہت پہلے بتا دینی چاہئے تھی لیکن جب تک مجھے علم ہوا کہ تم ملک صاحب کے آدمی ہو میں تمہاری محبت میں بری طرح گرفتار ہو چکی تھی..... ارسلان میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ خدارا! مجھے بچا لو ارسلان.....! میری ماں نے میرا گاہک تلاش کر لیا ہے اور وہ ملک صاحب کا خاص آدمی ہے۔“

آخری فقرہ اس نے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ ارسلان کو چھت گھومتی نظر آنے لگی۔

”چلو ہم بھاگ چلیں.....!“ اس نے اپنی دانست میں تمام مسائل کا حل تلاش کر لیا تھا۔

”لیکن کہاں؟ ارسلان تم ابھی بچے ہو۔ تم دنیا کو نہیں سمجھتے ارسلان۔ تمہیں علم نہیں کہ ملک نے اگر تم پر سے ہاتھ اٹھا لیا تو تم.....!“ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر باقاعدہ ٹسوے بہانے لگی۔

ارسلان نے بڑی مشکل سے اس کا ردنا دھونا بند کر دیا۔

”خدا کے لئے تین چار دن کے اندر کہیں سے پچیس ہزار روپیہ لاکر میری ماں کے منہ پر مار دو اور مجھے اس موذی سے بچا لو ورنہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ بھاں بھاں کرتی ہوئی پھر ارسلان کے سینے سے لگ گئی۔

”تم بے فکر ہو جاؤ میری جان! اگر تمہیں دولت دے کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے تو میں ساری دنیا کے خزانے تمہاری ماں کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔“

ارسلان تو ”دریام“ بننے پر تلا ہوا نظر آتا تھا۔

”اوہ ارسلان! کتنے عظیم ہوتم..... اور کتنے ذلیل ہیں یہ دنیا والے۔ ارسلان دراصل یہ دنیا پیار کے قابل ہی نہیں ہے۔ میں نے تو اپنی زندگی میں کبھی پیار کا تصور ہی نہیں کیا تھا۔ ارسلان! لیکن تم نجانے کہاں سے میری زندگی میں چلے آئے۔ تم نے تو پتھر میں شگاف ڈال دیا ہے ارسلان!“ اس نے ارسلان پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوئے اسے دنیا دماغیہا سے بے خبر کر دیا۔

اس سے پہلے دو پانچ..... ہزار کی فرمائشیں ہوا کرتی تھیں لیکن نازنین کی ماں بکرا ذبح کرنے پر تلی گئی تھی۔

جانے یہ سونے کی مرغی پھر اٹھ اڑے یا نہ دے۔

دوسری طرف ارسلان کا جی چاہتا تھا کہ وہ اختر کا منہ نوچ لے کیونکہ اس نے ہی سب سے پہلے اسے نازنین کے کوٹھے کا راستہ دکھایا تھا۔ اگر اسے علم تھا کہ یہ کوٹھا ملک صاحب کی نظر میں ہے تو وہ اسے وہاں لے کر ہی کیوں گیا؟

لیکن.....!

وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے قدم قدم پر سہاروں کی ضرورت تھی۔ کبھی وہ اختر کو اپنی بیساکھیاں بناتا، کبھی نواز کو اور کبھی جاوید کو۔ جس راستے پر وہ چل نکلتا تھا وہاں سامنے سے آنے والی گولی سے بچنے کے لئے اسے ہر وقت کسی نقاب کی، کسی ڈھال کی ضرورت تھی۔

اب اس اکیلے کے بس میں کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

سوائے اس کے کہ وہ اپنا الگ گروپ بنا کر ملک سے ہی نکل جائے لیکن اتنی ہمت کا مالک نہیں تھا وہ۔

اسے تو حالات نے موم کی گڑیا کی طرح اچانک کان سے پکڑ کر اس طرف گھما دیا تھا ورنہ تو شاید اس نے زندگی میں کبھی ایسے بھیانک تجربات سے گزرنے کا تصور ہی نہیں کیا تھا۔

حالات کی جس بھٹی کا ایندھن وہ بن چکا تھا اس میں اسے آخری لمحات تک جلنا ہی تھا۔

کبھی کبھی اسے بڑی شدت سے اپنا گھر باز والدین، بہن بھائی، ساتھی سگی، گاؤں، سکول، کالج اور وہ راستے یاد آتے جن پر وہ آوارہ ہرنوں کی طرح گھات میں لگے شکاریوں سے بے پروا چھلانگیں لگایا کرتا تھا۔

جانے صیاد کب سے اس کی گھات لگائے بیٹھا تھا۔

دو تین مرتبہ اس نے والدین کو سمجھانے اور منانے کی کوشش کی تھی لیکن توبہ کا دروازہ شاید اس پر بند ہو چکا تھا۔

کوئی اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر وہ اس بات کا یقین بھی کر لیتے کہ اس نے عابد پر گولی نہیں چلائی تب بھی وہ یہ کبھی ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ دین میں مسلح غنڈوں کے ساتھ عابد سے صلح کے مذاکرات کرنے وہاں گیا تھا۔

ہا.....!

خوش بختی کا پرندہ.....!

اس کے سر پر بیٹھ کر اڑ چکا تھا۔

اسے بادشاہت مل گئی تھی۔

وہ جرائم کی دنیا کا چھوٹا موٹا بادشاہ بن گیا تھا لیکن خوش نصیبی اس سے منہ موڑ چکی تھی۔

○

”میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ بڑا شاندار منصوبہ ہے۔ ہمیں اچھا خاصا مال بھی مل جائے گا اور اپنے دشمن جاوید سے نجات بھی مل جائے گی۔“ اختر کے شیطانی ذہن نے منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

”کیا.....؟“ ارسلان نے بے چینی سے دریافت کیا۔

جواب میں اختر نے اسے منصوبے کی جزئیات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ انہیں چھوٹے شہر میں بینک کی ایک ویگن پر حملہ کرنا ہے۔ ویگن میں موجود بینک کا مسلح گارڈ ان کا ساتھی ہوگا۔ وہ لوگ رقم حاصل کر لیں گے لیکن بینک کے گارڈ فائرنگ سے ان میں سے ایک کو مرنا ہوگا اور مرنے والا سوائے جاوید کے اور کون ہو سکتا ہے۔ یہی ایک صورت تھی اس سے نجات حاصل کرنے کی۔ اس رقم کی تقسیم میں بھی ایک حصہ دار کم ہو جائے گا۔ ان کی جوابی فائرنگ سے ایک گولی گارڈ کی ٹانگ وغیرہ میں بھی لگتی ضروری ہے۔

”یہ کارنامہ بھی میں ہی انجام دوں گا..... ہم تو یاروں کے لئے جان قربان کر دیا کرتے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا! اب میں بے وقوف نہیں بنوں گا.....!“ ارسلان نے دل ہی دل

میں کہا۔

ایک شیطانی منصوبہ اس کے ذہن میں بھی ترتیب پا گیا تھا.....!

”کتنی رقم ہوگی اندازاً؟“ اس نے اختر سے پوچھا۔

”یہی کوئی تین چار لاکھ! یا وہ مضافاتی علاقے کا بینک ہے وہاں اس سے زیادہ کیا

ملے گا؟“

”اور حصے دار کتنے ہوں گے.....؟“ ارسلان نے اگلا سوال کیا۔

رات کو ہی اختر بینک کے گارڈز سے ملنا ملنے لگے۔ چلا گیا اور رات کے دوسرے پہر واپس آ گیا۔ اس نے دوسرے دن کا پروگرام طے کر لیا تھا۔

تینوں مطمئن ہو کر لیٹ رہے۔

واردات کے دن تینوں الگ الگ موقعہ واردات کے قریب اکٹھے ہوئے تھے۔ اختر بس کے ذریعے وہاں پہنچا تھا جب کہ جاوید اور ارسلان موٹر سائیکلوں پر آئے گا۔ یہ دونوں موٹر سائیکلوں کی نمبر پلیٹیں بدلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے واردات میں یہی موٹر سائیکل استعمال کرنے تھے۔ جاوید کے چور ساسھی کو قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کے دوست کسی جرم کا ارتکاب کرنے جا رہا ہے۔ نہ ہی اس نے کسی اور کی شکل دیکھی تھی۔

ارسلان اور اختر کے پاس پستول تھے جبکہ جاوید نے ماؤزر تھام رکھا تھا۔ اس کے ذمے رقم کا تھیلہ اٹھا کر بھاگنا تھا۔ فراز کے لئے اک موٹر سائیکل ارسلان اور اختر نے جب کہ دوسری جاوید نے استعمال کرنی تھی اور دو پہر کے بعد انہوں نے شہر میں ایک جگہ اکٹھے ہو کر رقم تقسیم کرنا اور پھر الگ ہو جانا تھا۔

○

تینوں طے شدہ منصوبے کے مطابق مضافات سے شہر کو آنے والی اس ذیلی سڑک کے کنارے چھپے بیٹھے تھے جہاں سے وین کو رقم لے کر اس سے ملحقہ بڑی سڑک پر پہنچ کر شہر جانا تھا۔ اس کچی سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ یوں بھی شدید سردی اور اس پر دور دراز سے ہونے والی بارش نے لوگوں کو گھروں میں دیکر رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

انہوں نے موٹر سائیکل جھاڑیوں میں چھپا رکھے تھے اور خود راستے پر نظریں گاڑنے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی گھڑی کی سوئیاں مقررہ وقت پر پہنچیں ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

دور سے انہوں نے وین اس طرف آتے دیکھ لی تھی اور اب منصوبے کے مطابق انہوں نے ہاتھوں میں پکڑے پتھر سڑک پر لڑھکا دیئے تھے۔ وین کے ڈرائیور کے تو دہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ یوں بھی دھند کی وجہ سے دوز کی چیزیں صاف دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اچانک ہی جب اسے سڑک پر پتھر نظر آئے تو اس نے پوری قوت سے بریک لگائی۔ شاید اس کی چھٹی حس نے پیش آمدہ خطرے کی نشاندہی کر دی تھی کیونکہ اس نے

”تین.....!“

”ہونہہ..... فرض کیا تین لاکھ رقم ہے تو ایک ایک لاکھ کے لئے ہم اپنی جان داؤ پر لگائیں گے۔“ ارسلان نے بیزاری کے لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ اختر کو سمجھ تو آ گئی تھی لیکن وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

”ایک حصے دار اور کم ہو جائے تو ہم دونوں کو قابل ذکر رقم مل جائے گی۔“ اس نے اختر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”یاد تمہاری بات تو دل کو لگتی ہے لیکن.....؟“

”لیکن وہی کچھ نہیں.....!“ اس نے اختر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”بھئی دیکھو ناں جاوید سے تم نجات حاصل کرنا چاہتے ہو۔ ظاہر ہے وہ چوکیدار کی گولی سے مرے گا..... اور تم اس کی ٹانگ میں گولی مارو گے لیکن ٹانگ ہی میں کیوں؟ سر میں کیوں نہیں؟“ اس کا لہجہ بڑا خونخوار تھا..... ”میرے برادر! یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ دوران تفتیش بھانڈہ پھوڑ دے..... اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ چھوٹا آدمی ہے پیسہ ہی ہضم نہ کر سکے..... سوچو! ذرا سوچو..... اور ہاں!! گارڈ ہمارے ساتھی کو مارے گا۔ جو ہمارے دوست کو قتل کر دے اسے بھی قتل تو ہونا چاہئے..... خون کا بدلہ خون۔“

آج ارسلان کو اختیار آیا۔ بدلے ہوئے انسان کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ بالکل ایسے جیسے کوئی زخمی چیتا شکاریوں کے زخموں میں پھنسا ہو۔

”ڈن.....!“ اختر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

”ڈن.....!“

○

اسی روز شام کو اختر اپنے ساتھ جاوید کو لے کر ارسلان کی طرف گیا۔ تینوں نے اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا کہ ان کی آپس میں ملاقات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ خاص طور سے انہوں نے ملک صاحب کو اس میٹنگ کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ ان کی خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ ملک اس روز رات کی فلائٹ سے دوسرے شہر چلے میں تقریر کرنے جا رہا تھا۔

لیکن.....!

ابھی ڈراپ سین باقی تھا۔

اس سے آگے کا منصوبہ ارسلان نے خود طے کیا تھا۔ جاوید سے تو اسے گارڈ نے نجات دلا دی تھی۔ گارڈ کو اختر نے مار ڈالا لیکن اختر اب اس کے بہت سے گناہوں میں شریک تھا۔ یوں بھی اس نے ارسلان کو ساری زندگی بلیک میل کرتے رہنے کے لئے ملک صاحب کی داشتہ سے ٹکرا دیا تھا۔

یہ بھی تو ممکن تھا مستقبل میں اختر ہی اس کے لئے چھانسی کا پھندہ بن جائے.....؟

اس نے اچانک ہی پستول اختر کی کپٹی پر رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ صورت حال کے اچانک بدل جانے پر حواس باختہ اختر کچھ سمجھ پائے، یکے بعد دیگرے تین گولیوں نے اس کا بیجا اڑا کر رکھ دیا۔

زمین پر لیٹے دونوں دہشت زدہ انسانوں کو سمجھ ہی نہ آ سکی کہ ان کے نزدیک ہوس اور درندگی کا کیسا ہولناک کھیل جاری ہے..... کیشیز جو کنزرو دل کا آدمی تھا، اسی لمحے بے ہوش ہو گیا.....!

ارسلان نے پھرتی سے تھیلا سنبھالا۔ اسے موٹر سائیکل پر موجود دوسرے تھیلے میں منتقل کیا۔ دوسری موٹر سائیکل کا پٹرول پائپ کھینچ کر اس نے پٹرول باہر گرنے دیا پھر کچھ فاصلے سے پٹرول پر ماچس کی جلتی ہوئی تیلی پھینک دی۔

موٹر سائیکل جلنے لگی تھی.....!

دوسرے ہی لمحے وہ اپنی موٹر سائیکل کو سڑک کی طرف اڑائے چلا جا رہا تھا۔ اسے منصوبے کے باقی حصوں پر خود ہی عمل کرنا تھا۔ چہرے سے لگی نقاب اس نے اتار کر پھینک دی تھی۔ جب تک دونوں کو ہوش آتا وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

منصوبے کے مطابق وہ بڑی سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دریا کے پل تک پہنچ گیا۔ یہ پل یہاں ہنگامی طور پر بنایا گیا تھا۔ پل پر کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور موٹر سائیکل سے تھیلا اتار کر اسے دریا برد کر دیا۔

اب وہ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ اس درخت کی طرف بھاگ رہا تھا جہاں ان

اچانک ہی گاڑی کو رپورس کر کے بھاگنے کا ارادہ کیا تھا۔
لیکن.....!

اس کے دل کی دل میں رہ گئی کیونکہ اختر نے وین کے دونوں ٹائروں کو فائرنگ کر کے پھاڑ دیا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق ماؤزر ہاتھ میں تھا۔ جاوید وین کے کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے تو یہی علم تھا کہ اندر سے کوئی مزاحمت نہیں ہوگی اور وہ تھیلا اٹھا کر موٹر سائیکل کی طرف بھاگے گا۔

لیکن.....!

جیسے ہی وہ وین کے دروازے کے نزدیک پہنچا۔ اندر مسلح گارڈ جسے اختر نے منصوبے کی جزئیات سے آگاہ کر رکھا تھا۔ اچانک اٹھا اور اس نے اپنی بارہ بور کی بندوق جاوید کی طرف سیدھی کر لی۔ جاوید اپنی دھن میں رقم والے تھیلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر کے خود کو تیار کرے۔ گارڈ کی رائفل نے شعلہ اگلا اور کارتوس سیدھا اس کے سینے میں داخل ہو گیا۔

جاوید کو اگلا سانس لینے کی مہلت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ بارہ بور کے کارتوس سے اس کا زندہ بچ نکلنا ناممکن تھا.....!

منصوبہ بڑا شاندار تھا.....!

کیونکہ گارڈ کے دوبارہ بندوق لوڈ کرنے تک دوسرے لٹیرے اس پر قابو پا لیتے اور وہ ”بے چارہ“ کچھ نہ کر پاتا۔ انکوائری میں بھی اسے بہادری پر انعام ملتا۔

منصوبے کی دوسری کڑی کے مطابق دونوں نے گارڈ، ڈرائیور اور کیشیز کو باہر نکال کر تھیلا اٹھالیا اور اختر کے پیچھے کھڑے ہو کر اسے اگلا اشارہ کر دیا۔

اختر نے مردہ جاوید کا موٹر اٹھایا اور اونڈھے منہ زمین پر لیٹے گارڈ کے سر میں گولیاں اتار دیں۔ اسے بھی جاوید کی طرح اگلا سانس لینے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ وہ جس پوزیشن میں زمین پر لیٹا تھا اسی حالت میں زمین کا رزق بن گیا۔

بظاہر منصوبہ مکمل تھا اور اب دونوں نے موٹر سائیکلوں پر فرار ہونا تھا۔

محسوس تو کیا تھا لیکن کسی نے خاص ذکر نہیں کیا۔

رات دیر گئے وہ نازنین کے پاس پہنچ گیا۔ مطلوبہ رقم اس نے نازنین کی نائیکہ ماں کی جھولی میں ڈال دی اور رات بھر اس کے ساتھ اپنا غم غلط کرتا رہا۔ دوپہر کے بعد اپنے گھر پہنچ گیا کیونکہ ملک صاحب نے شام کی فلائٹ سے واپس آنا تھا اور اس نے پارٹی کارکنوں کے ساتھ انہیں ایئر پورٹ پر لینے جانا تھا۔



لوگوں نے موقعہ واردات پر جانے سے پہلے بیک چھپا دیا تھا جسے انہوں نے بعد میں استعمال کرنا تھا۔



گھنے درخت کی آڑ میں چھپ کر اس نے بیک سے کپڑے نکال کر تبدیل کئے۔ اپنے جسم پر موجود کپڑے جو اس کے سائز سے کم از کم دو گنا بڑے تھے اور اس نے اس واردات میں استعمال کرنے کے لئے غریب بازار سے خریدے تھے، بیک کے تھیلے میں ڈال دیئے۔ تھیلے والی رقم اس نے بیک میں منتقل کر لی تھی اور بیک میں موجود کپڑوں کے دو جوڑوں میں سے ایک جوڑا خود پہن لیا تھا۔ گرم چادر اس نے مقامی لوگوں کی طرح اوڑھ لی تھی اور اب بڑے اطمینان سے چلتا ہوا سڑک کی طرف جا رہا تھا۔

تین چار منٹ بعد ہی اسے ایک مسافر بس اس طرف آتی دکھائی دی اور وہ بس کے ذریعے اپنے شہر کی بجائے دوسرے شہر کی طرف عازم سفر تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ اس شہر میں اتر گیا۔ یہ شہر اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہاں کے سکول میں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنے سکول کے زمانے کا اکاؤنٹ اس نے کبھی ختم نہیں ہونے دیا تھا اور ملک صاحب یا اس کے کسی دوست کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ کسی اور شہر میں بھی اس کا کوئی اکاؤنٹ ہے۔



رات اس نے یہاں بسر کی اور صبح بینک میں کچھ رقم اپنے نام سے جمع کروا کے اپنے شہر کی طرف چل دیا۔ اخبار میں اس نے ڈاکے کی خبر تو پڑھ لی لیکن ابھی تک پولیس مرنے والے ڈاکوؤں کی شناخت کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

وہ جانتا تھا شناخت میں بھی دو تین روز لگ جائیں گے۔ اس دوران اس نے باقی معاملات سے نمٹنا تھا۔ اپنے شہر پہنچ کر اس نے آدھی سے زیادہ رقم یہاں تین بینکوں میں موجود اپنے اکاؤنٹس میں منتقل کر دی اور باقی رقم کے ساتھ اطمینان سے گھر واپس آ گیا۔

ابھی تک کسی کو اس کے رات بھر غائب رہنے کا علم نہیں ہوا تھا۔ رات کو وہ معمول کے مطابق اپنی چندال چوکڑی کے ساتھ معمول کی سیر کو نکل گیا۔ انہوں نے اختر اور جاوید کی کمی کو

تک ہمارے ساتھ تھا۔ بلکہ کل پرسوں دوسرے لوگوں نے بھی اس کی کمی محسوس کی..... ملک صاحب! برامت مایہ۔ یہ لوگ آپ سے کچھ زیادہ ہی لفت لے رہے ہیں اور دوسرے کارکن اس بات کو بہت محسوس کرنے لگے ہیں..... اب یہی لے لیجئے ان لوگوں کا خیال تھا کہ جاوید آپ کے ساتھ ہے۔“

ارسلان نے الٹا چور کو توال کو ڈانٹنے والی حکمت عملی سے کام لیا۔

”نہیں بیٹا! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میرے لئے سب کارکن قابل عزت ہیں..... تم جانتے ہو کہ میں سب سے زیادہ تمہیں چاہتا ہوں لیکن اب مجھے ان دونوں کے متعلق تشویش ہونے لگی ہے، کہیں وہ مخالفوں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئے؟“

ملک نے عندیہ ظاہر کیا۔

”ملک جی اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو ہمیں خبر ہو جاتی۔ آپ جانتے ہیں اس وقت بھی ان کے ہیڈ کوارٹر میں اپنے تین آدمی کام کر رہے ہیں۔ ان کی طرف سے ایسی کوئی اطلاع تو نہیں ملی۔ پرسوں ان لوگوں نے خاور پر حملہ کیا تھا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا ہے۔ اگر ان دونوں.....“ تھوڑی دیر کے لئے وہ رک گیا، پھر اچانک کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”پھر بھی میں پتہ کر دیتا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ملک کے فون سے ہی مخالف تنظیم کے ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملایا۔

”میرا نام سلیم ہے جی! ذرا مشتاق صاحب کو بلا دیں۔ بہت ضروری کام ہے۔“ اس نے دوسری طرف سے استفسار پر کہا۔

تھوڑی دیر بعد مشتاق لائن پر تھا۔ اس نے ہوں ہاں کرتے ہوئے ارسلان کی بات سنی۔

”نہیں بھائی جان سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ یہاں آتے تو مجھے ضرور ملتے۔ میں تو یہاں چار روز سے کہیں گیا ہی نہیں۔ امتحانات کی تیاری کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے جواب ملا۔

”ٹھیک ہے پھر تو اور پریشانی والی بات ہو گئی ناں۔“ اس نے کہا۔

”آپ خود تکلیف نہ کیا کریں۔ میں بتا دوں گا جب بھی ادھر آئے۔“ دوسری طرف

شطرنج کے مہرے

ملک صاحب کو وہ لوگ حسب روایت پھولوں کے ہار سے لاد کر جلوس کی شکل میں ہوائی اڈے سے ان کے گھر تک لے کر آئے تھے۔

اس درمیان ملک صاحب نے خاص طور پر اختر اور جاوید کی غیر حاضری محسوس کی تھی جس کا ذکر انہوں نے گھر پہنچتے ہی ارسلان سے کیا۔

”سناؤ کیسے رہے تین چار دن حالات؟“

”سرجی! مزہ آ گیا۔ ہم نے اپنے چاروں ساتھیوں کا بدلہ لے لیا ہے۔ وہ جو کالج والا لڑکا ہے نا اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دی ہیں اور اس جنرل سیکرٹری کی اولاد کو بھی ٹھپہ لگا دیا ہے..... سا لے کیا یاد کریں گے۔“ اس نے ملک صاحب کو اپنی کارگزاریوں سے آگاہ کیا۔

”وہ دونوں اختر اور جاوید نظر نہیں آ رہے.....!“ ملک صاحب نے پوچھا۔

ایک لمحے کے لئے تو ارسلان کا دل زور سے دھڑکا لیکن اب اس کے لئے یہ سب کچھ ایسی غیر معمولی بات نہیں رہی تھی۔ اس نے انسانی اذیت کی انتہا کر بھی دی تھی اور دیکھ بھی لی تھی اس لئے اب کوئی قتل اس کے سرچڑھ کر بول نہیں سکتا تھا۔

”جاوید کو دیکھ تو مجھے بھی سات آٹھ روز ہونے کو آئے ہیں اختر البتہ تین چار روز پہلے

کوئی واردات کرنے جا رہا ہے۔ واردات کی نوعیت سے وہ بے خبر تھا۔

ارسلان کے ساتھیوں نے ٹھونک بجا کر تسلی کر لی تھی کہ اس کا بیان حرف بحرف درست ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹیلی فون پر ملک صاحب کو تفتیش کے نتائج سے آگاہ کر رہے تھے۔ ملک صاحب کے حکم پر جس طرح اس چور کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں لائے تھے اسی طرح اس کے ٹھکانے پر چھوڑ آئے۔

رات گئے تک وہ لوگ اندازے قائم کرتے رہے کہ جاوید نے موٹر سائیکلیں کس لئے حاصل کی تھیں۔ اچانک سکندر کو چند روز پہلے والی واردات یاد آ گئی۔ ڈکیتی کی یہ خبر اخبارات میں دو تین روز تک زیر بحث رہی تھی۔ اس نے سب کا دھیان اس خبر کی طرف دلایا۔

”لیکن وہاں تو لکھا تھا کہ ڈاکو تین تھے اور تیسرا فرار ہو گیا ہے۔ بھاگنے سے پہلے وہ اپنے ایک ساتھی کو بھی گولی مار گیا تھا۔“ اکبر بولا۔

”کچھ بھی ہو“ آخر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ ابھی تک لاشوں کی شناخت تو نہیں ہو سکی۔“ ارسلان نے رائے دی۔

”ارسلان بیٹا! تم سکندر کو لے کر اس مہم پر نکلو۔ کوشش کرنا کہ پولیس کو لاعلم رکھ کر اس کی شناخت کر سکو۔ اگر خدا خواستہ وہ اپنے ہی بندے ہوئے تو چپ چاپ نکل آنا۔ ابھی ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ایکشن سر پر کھڑا ہے اور مجھے پارٹی ٹکٹ مل چکا ہے۔!“ ملک صاحب نے کہا۔

”آپ بے فکر ہیں ملک صاحب! اگر تو لاشیں ابھی مردہ خانے میں ہیں تو پولیس کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ اگر انہوں نے لاشیں ضائع کر دی ہیں پھر تصاویر تو ظاہر ہے پولیس کے قبضے میں ہی ہوں گی۔“ سکندر بولا۔

میرے خیال سے ابھی تک لاشیں سنبھالی ہوئی ہیں۔ بصورت دیگر اخبارات میں تصاویر ضرور شائع کی جاتیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ پولیس نے اس ڈکیتی میں مرنے والوں کی تصاویر شائع نہیں ہونے دیں۔“ ارسلان بولا۔

”شاید انہیں تیسرے آدمی کی تلاش ہو۔ وہ سمجھتے ہوں کہ تصویروں کے شائع ہونے سے تیسرا ڈاکو ہوشیار نہ ہو جائے۔“ سکندر نے اپنی رائے دی۔

ہے کہا گیا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

نہ، کالج۔“ ملک صیاحب! کمال ہے۔ آخر انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔“ ارسلان نے پریشانی کا اظہار کیا۔

”ان کے سارے ٹھکانے چیک کرو۔ سمجھ نہیں آتی اس طرح بتائے بغیر وہ جانے والے نہیں۔۔۔۔۔ ایک بات تو ظاہر ہے وہ دونوں اکٹھے ہی غائب ہوئے ہوں گے۔“ ملک صاحب نے خود بخود ایک اندازہ قائم کرتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں“ ٹھیک ہے جناب! ابھی دیکھ لیتے ہیں۔۔۔۔۔“ کہتے ہوئے ارسلان نے دو تین ٹیلی فون نمبر ملائے لیکن جواب میں ہر طرف مایوسی کا اظہار کیا گیا۔ آدھ گھنٹہ تک دونوں کوشش کرتے رہے لیکن انہیں نہ ملنا تھا نہ ملے۔

”ملک کے چہرے پر اب کچھ پریشانی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔“ یہ لوگ کچھ زیادہ ہی لفٹ لینے لگے ہیں۔ میں نے کہہ رکھا ہے کہ مجھے بتائے بغیر کوئی واردات نہیں کرنی لیکن۔۔۔۔۔!“ اتنا کہہ کر ملک خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

”ارسلان! تم خود ایک کام کرو۔ جاوید کا ایک سکوتر چور دوست ہے۔ میں جانتا ہوں اسے۔ ایک دو مرتبہ اس نے سفارش کروائی ہے اس کی۔ مجھے شک ہوتا ہے کہ وہ کہیں اس کے ساتھ مل کر تو کوئی چکر نہیں چلا رہا۔۔۔۔۔ کہیں پھنس نہ گیا ہو۔۔۔۔۔ لیکن آخر۔۔۔۔۔“

ملک کو اچانک ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔

”آپ اطمینان رکھئے جناب میں ابھی نکلتا ہوں اس مشن پر۔“ ارسلان نے ملک سے کسی سکوتر چور دوست کا ایڈریس سمجھتے ہوئے کہا۔

○

اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ وہی ہوگا جس سے جاوید نے موٹر سائیکلیں اس واردات کے لئے حاصل کی تھیں۔ اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ وہ اس کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے اس چور دوست کو رات تک قابو کر لیا تھا اور اب اپنے تفتیشی سینٹر میں لے آئے تھے۔

پہلے تو وہ جاوید سے ملاقات ہی سے انکار کرتا رہا لیکن دو تین منٹ کے بعد ہی اس نے انہیں بتایا کہ کچھ روز پہلے جاوید اس سے دو موٹر سائیکلیں مستعار لے گیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ وہ

خوف کی ایک لہر ارسلان کی ہڈیوں میں سرایت کر گئی۔

اگلے روز وہ سکندر کے ساتھ واردات والے شہر کے سرکاری مردہ خانے کی طرف چا رہے تھے۔

مردہ خانے کے باہر پولیس گارڈ مستعد بیٹھی تھی لیکن ارسلان نے انہیں ”رام“ کر لیا۔ اس نے حوالدار سے کہا تھا کہ ان کا ایک ساتھی کچھ دنوں سے غائب ہے اور اپنا شیک دور کرنے کے لئے ہر نامعلوم لوش کو دیکھنے چلے آئے ہیں۔

”لیکن باؤجی یہ تو ڈاکو تھے!“ حوالدار نے گہری نظروں سے دونوں کا جائزہ لیا۔

”یار وہ بھی کوئی شریف آدمی نہیں تھا.....!“ ارسلان نے سو کا ایک نوٹ حوالدار کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔

”کم ہے جناب‘ تین آدمی ہیں۔“ اس نے سو کے نوٹ پر نظر ڈال کر بے حیائی سے دانت نکال دیئے۔

”اچھا یار ہم بھی کوئی امیر آدمی نہیں ہیں بس اور بات نہ کرنا۔“ اتنا کہتے ہوئے سکندر نے بچاس کا ایک نوٹ اس کا ہتھ دیا۔

”ایسا ایک اور نکالیں باؤجی!“ حوالدار نے ڈھٹائی سے دانت نکال دیئے۔

”یار تم تو حد کر رہے ہو۔“ ارسلان نے بیس روپے اس کی طرف بڑھا کر مردہ خانے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”جیسی مرضی جناب کی.....!“ حوالدار نے نوٹ اپنی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

ارسلان کے لئے تو یہاں کچھ بھی خلاف توقع نہیں تھا لیکن سکندر تو سناٹے میں آ گیا۔

”اف میرے خدا یا تمہارا شک صحیح ثابت ہوا.....!“ ارسلان نے سکندر کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”یار میں نے تو اندازہ ہی لگایا تھا۔ تم جانتے ہی ہو مبینے میں ایک آدھ بار کارروائی تو پٹرول پمپ وغیرہ لوٹنے کی جاوید ڈال ہی دیا کرتا تھا لیکن اختر! اور پھر وہ تیسرا کون تھا؟“ سکندر خاموش ہو کر دیوار کو گھورنے لگا۔

”اختر بھی چھپا رستم نکلا۔ میرا خیال ہے انہوں نے کسی پیشہ ور کھلاڑی کے ساتھ ہمیں

لا علم رکھ کر کارروائی ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔ تم تو جانتے ہو یا آج کل جاوید کا باز احسن میں جانا کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا..... بہانہ تو ملک صاحب کا ہی ہوتا تھا۔ شاید وہاں کوئی معاشقہ چل رہا تھا اور یار جی نے اپنی محبوبہ پر رعب گانٹنے کے لئے لمبا ہاتھ مارنے کی سوچی ہوگی..... میرے ذہن میں تو یہی بات آتی ہے لیکن یہ اختر کہاں سے پھنس گیا؟“

ارسلان کا چہرہ بالکل نارمل تھا۔

وہ اتنا پرسکون نظر آ رہا تھا جتنا کوئی عادی مجرم بھی نہ آ سکے۔

جرائم مار دھاڑ تشدد اور جنسیات کے سیلاب میں بہہ کر شاید اس کے اندر موجود ضمیر نام کی چیز یا ڈگنی تھی یا چہرے پر احساس ملامت کو چھپائے رکھنے میں اس نے کمال حاصل کر لیا تھا۔

○

دونوں نے ملک صاحب کو رپورٹ دی تو ایک لمحے کے لئے ملک صاحب کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اگر یہ خبر مخالف تنظیم کی ہو جاتی کہ انقلابی تنظیم کے دو اہم رکن ڈاکہ زنی کی واردات میں مارے گئے ہیں تو وہ ملک صاحب کا سیاسی حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتے۔

شام تک وہ فکر میں غطان رہا کہ اب کیا کیا جائے؟ ارسلان اور سکندر واپس آ چکے تھے۔

”جس طرح بھی ممکن ہو اس خبر کو چھپانا ہے عوام کی نظروں سے اور سب سے بڑھ کر دشمنوں کی نظروں سے۔ اگر کسی کو علم ہو گیا تو قیامت آ جائے گی۔“

ملک صاحب کو ان لوگوں نے آج پہلی مرتبہ اتنا پریشان دیکھا تھا۔

”کیا طریقہ ہو سکتا ہے سر؟“ سکندر نے پوچھا۔

”لاشوں کو لاوارث قرار دے کر دفن کروا دو۔ جتنی جلدی ممکن ہو۔“ ملک نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”لیکن سر.....!“

”کیا لیکن.....؟“ سکندر نے کچھ کہنا چاہا لیکن ملک صاحب نے اس طرح پھاڑ

کھانے والے لہجے میں اس کی بات کافی کہ وہ لرز کر رہ گیا۔

اس کے فیصلے بڑے سفاکانہ ہوتے تھے۔

اس نے ایسی ہی چالبازیوں کے سہارے سیاست کے جانے کتنے خاردار پاٹ لئے تھے۔ جن الفین کو ملک نے کبھی بھونکنے والے کتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کا اصول تھا کہ کاٹنے والے کتے بھونکا نہیں کرتے، جیسا کہ بھونکنے والے کتے کاٹا نہیں کرتے۔ ملک کے ہر اہی جانتے تھے کہ کبھی وہ کچھ نہیں کہتا جو اس نے کرنے کی ٹھانی ہو اور جو کرنے کی ٹھان لے اس سے کبھی نہیں رکتا، خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

○

اگلے روز علی الصبح دونوں اپنی منزل کی طرف عازم سفر تھے۔ ان کی آمد سے پہلے ڈی ایس پی کے ساتھ ”مک مکا“ ہو چکا تھا۔ اس کی حیثیت کے مطابق اس کی قیمت چکا دی گئی تھی اور اب ان دونوں نے اپنی موجودگی میں باقی معاملے طے کروانے تھے تاکہ ملک صاحب کو ”سب اچھا“ کی حتمی رپورٹ دے سکیں۔

مقتولین کی لاشیں ناقابل شناخت قرار پا چکی تھیں۔ پولیس کے مستعد ہلکاروں نے راتوں رات کاغذات مکمل کر کے صبح مقامی مجسٹریٹ کے حضور پیش کر دیئے تھے۔ ضابطے کی کارروائی مکمل تھی۔

ریٹائرنگ روم میں تشریف فرما مجسٹریٹ صاحب بہادر نے کاغذات پر سرکاری مہر کے ساتھ دستخط ثبت کر دیئے اور اب لاشوں کو کفن و دفن کے معاملات سے گزارا جا رہا تھا، لاشیں دفن کر دی گئیں۔

لیکن.....!

دونوں جانتے تھے کہ راتوں رات ان لاشوں کو بھی لیبارٹریوں میں پہنچا دیا جائے گا جہاں میڈیکل کے طلباء ان پر تجربات کریں گے اور اس کی الگ قیمت وصول کی جائے گی۔ دوپہر تک تمام مراحل بخیر و خوبی طے پا گئے اور دونوں ہونہار و درکروں نے ملک صاحب کو مقامی ٹیلی فون آپیکسینج سے ہی ”سب اچھا“ کی رپورٹ دے دی۔

عین ان لمحات میں جب وہ دونوں اس قصبے میں ایک غیر انسانی اور وحشیانہ کام میں مصروف تھے ان کے ساتھی اپنے وکیل کے ساتھ شہر کے ایس پی صاحب کے دفتر میں جھگھا لگائے

”مم..... میرا مطلب.....“ اس نے کھکھیاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

”تمہارا مطلب تھا کہ ان دونوں شہیدوں کے جنازے بڑی شان و شوکت کے ساتھ اٹھائے جاتے کیونکہ انہوں نے بڑا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے یا پھر وہ دشمن تنظیم کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔“ ملک صاحب نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”سکندر پاگل مت بنو..... سر کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرو اور یہ مت بھولو کہ تم بھی تین مقدمات میں پولیس کو مطلوب ہو۔ میرے متعلق بھی تم جانتے ہو۔ اگر ان لاشوں کی شناخت ہوگئی تو کھاتہ کھل جائے گا اور مخالف تنظیم ہمارے خلاف اتنا پراپیگنڈہ کرے گی کہ لوگ ہمارے منہ پر تھوکتا پسند نہیں کریں گے۔“ اس مرتبہ ملک کی بجائے ارسلان نے سکندر کی طرف دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے اسے ”موقعے کی نزاکت“ کا احساس دلایا۔

سکندر اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ارسلان نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ ملک صاحب کو اپنے باغیانہ خیالات کا احساس نہ ہونے دیں بصورت دیگر ان کے لئے مسائل کا ناقابل عبور پہاڑ کھڑا ہو جائے گا جس سے سر ٹکرائے گا وہ پاش پاش ہو جائیں گے۔

سکندر نے معذرت خواہانہ انداز میں اپنی گردن جھکا کر ملک صاحب کی اطاعت پر صاد کر دیا تھا۔

”اس علاقے کے ڈی ایس پی صاحب سے مل لینا۔ میں اس دوران اسے قابو کرتا ہوں۔ لاشوں کو لاوارث قرار دے کر دفن کرنے کا بندوبست کرنا ہوگا اور تمہیں ہر مرحلے پر ان لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ نیچے والے عملے کو قابو میں رکھنا پیسوں کی پروا نہ کرنا..... اور ہاں مشتاق سے کہنا کہ آج شام ہی دونوں کے اغوا کی رپورٹ پولیس کو لکھوا دے۔ اس اغوا میں مخالف تنظیم کے مقامی صدر اور جنرل سیکرٹری کے علاوہ کم از کم آٹھ دس ایسے درکروں کو ملوث کر دو جن کا آزار دہنا ہمارے لئے خطرناک ہوگا۔ وکیل سے مل لینا۔ وہ تمہیں ساری کہانی سمجھا دے گا اور پرچہ درج کروانے تمہارے ساتھ بھی جائے گا۔

خبردار موقعے کے گواہ ذرا مضبوط تیار کرنا۔ میں نہیں چاہتا کہ اگلے الیکشن سے پہلے ان لوگوں کی ضمانتیں ہوں اور یہ باہر آ کر ہمارے لئے مسائل کھڑے کریں۔“

ملک نے ایک تیر سے کئی شکار کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

چکیاں لیتے ہوئے ”حصہ بقدر جتنہ“ کے مصداق سب اس پریس کانفرنس کے کرتادھرتا کی طرف سے فراہم کردہ لفافے اپنی جیبوں میں منتقل کرنے لگے۔

پریس اور اخبارات ایک ساتھ حرکت میں آئے.....!

نمایاں سرخیوں کے ساتھ خبریں چھپیں جبکہ راتوں رات پولیس کے مسلح جوانوں نے ایف آئی آر میں نامزد ملزمان میں سے آدھے سے زیادہ اپنے قابو میں کر لئے۔ ان میں وہ بے چارے بے گناہ نوجوان شامل تھے جو امتحانات کی تیاری کر رہے تھے یا پھر جن کے صبح پیپر ہونے والے تھے۔

بعد از خرابی بسیار پولیس ملزمان کے سرکردہ لیڈروں یعنی مقامی صدر اور جنرل سیکرٹری کو گرفتار نہیں کر سکی تھی نہ ہی ابھی تک اغوا کنندگان کو برآمد کیا جاسکا تھا۔

اگلے روز شام کو مقامی پولیس کی طرف سے پریس کانفرنس میں کہا گیا کہ پولیس نے سارے شہر کی تاکہ بندی کی ہوئی ہے اور ملزمان بچ کر نہیں جاسکتے خواہ وہ کتنے ہی بااثر ہوں قانون کی گرفت سے نہیں نکل پائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انقلابی طلباء تنظیم کے کارکنوں کو پر امن رہنے کی اپیل کی گئی تھی۔

پولیس کی اس اپیل کے جواب میں انقلابی طلباء تنظیم کے صدر مشتاق نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ وہ پولیس کی طرف سے یقین دہانی کے بعد اپنے الٹی میٹم میں 48 گھنٹے کا اضافہ کر رہے ہیں اور مزید دو دن کے اندر اگر ان کے ساتھیوں کو برآمد نہ کیا گیا تو وہ سڑکوں پر نکل آئیں گے۔

”بے خبر“ اور ”باخبر“ دونوں طرح کے اخبارات نے اپنی استعداد کے مطابق اس سانحے پر ادارتی نوٹ بھی اگلے روز شائع کئے تھے۔ ہوشیار اخبار نویسوں نے کسی پر الزام دھرے بغیر کسی کا نام لئے بغیر اس قبیح فعل کی زبردست مذمت کی تھی اور صوبائی حکومت کے لئے اس واقعے کو ایک چیلنج قرار دے کر کہا تھا کہ جلد از جلد اغوا کنندگان کو برآمد کروایا جائے۔ اخبارات نے اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ طلباء کی سیاست میں اس حد تک تشدد خطرے کی گھنٹی ہے اور اس کا سختی سے قلع قمع کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔

بعض مبصر تو بہت دور کی کوڑی لائے تھے اور انہوں نے اس واردات کے پس پردہ

کھڑے تھے۔ اس ہجوم کی قیادت انقلابی طلباء تنظیم کا صدر مشتاق کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو زنجی طالب علم موجود تھے۔ ایک کے بقول اس کے ہاتھ پر گولی لگی تھی اور دوسرے کی ران میں خنجر سے زخم لگایا گیا تھا۔

ان لوگوں نے حلفیہ بیان دیا کہ وہ اختر اور جاوید کے ساتھ بس سٹاپ پر وینگن کے منتظر تھے کہ وہیں اچانک ایک وین آ کر رکی جس میں موجود پندرہ بیس لڑکے ان پر پل پڑے۔ حملہ آوروں کی قیادت مخالف طلباء تنظیم کا صدر اور سیکرٹری جنرل کر رہے تھے۔ انہوں نے ریوالوروں، خنجروں اور ڈنڈوں سے حملہ کیا۔ صدر نے نذیر پر گولی چلائی جو اس کے ہاتھ پر لگی جب کہ جنرل سیکرٹری کے خنجر کا وارہ دوسرے طالب علم حیات کی ران پر ہوا۔ وہ دونوں گر پڑے۔ حملہ آوران کے دونوں ساتھیوں اختر اور نواز کو اغوا کر کے لے گئے۔

دکیل نے اپنی موجودگی میں پرچہ درج کروایا اور ایف آئی آر ی نقل بھی حاصل کر لی تھی۔ ضابطے کی کارروائی مکمل ہوتے ہی مصدروں کو سرکاری ہسپتال پہنچا کر وہاں سے اپنی مرضی کی ”میڈیکل رپورٹ“ حاصل کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہنگامی پریس کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں ملک صاحب کے مختلف اخبارات میں پروردہ رپورٹرز اس طرح پہنچے جیسے انہیں نجانے کب سے اس پریس کانفرنس کا انتظار تھا یا پھر جیسے یہ پریس کانفرنس کسی نازک ترین قومی مسئلے پر طلب کی گئی ہو۔

○

انقلابی طلباء تنظیم کے صدر مشتاق نے تمام ”تیار شدہ“ واقعات کی تفصیلات مزید مرجع مصالح لگا کر بیان کیں۔ مخالف تنظیم کی غنڈہ گردی، دہشت گردی کا جی بھر کے رونا روایا اور پولیس کو وارنٹ دی کہ اگر 24 گھنٹے کے اندر ان کے اغوا شدہ ساتھی برآمد نہ ہوں اور حملہ آوروں کو گرفتار نہ کیا گیا تو اس کے لئے طلباء برادری کے جذبات پر قابو رکھنا ممکن نہیں رہے گا اور حالات بگڑنے کی تمام تر ذمہ داری پھر پولیس پر عائد ہوگی۔

اس دھمکی کے ساتھ ہی پریس کانفرنس اپنے اختتام کو پہنچی۔ اخبار نویسوں نے اپنے سامنے موجود پیسٹریوں اور پیٹیز کے ڈھیر پر حملہ کر دیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس وقت تک کھاتے رہے جب تک کسی پلیٹ میں کوئی ایک کھانے والی شے بھی موجود رہی۔ چائے کی

سیکورٹی والوں کی طرف سے اس بات کی یقین دہانی کروادی گئی تھی کہ لڑکے اغوا نہیں ہوئے نہ ہی ایسا کوئی واقعہ ہوا ہے جس کی رپورٹ لکھائی گئی ہے۔ یہ سب من گھڑت کہانی تھی اور رپورٹ درج کروانے والوں نے خود ہی اپنے ساتھیوں کو زخمی کر کے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔

آئی جی نے مخالف تنظیم کے مرکزی صدر سے مذاکرات کر کے منت ساجت بھی کی تھی کہ وہ اپنے ضلعی مفروضہ اور جنرل سیکرٹری کو پیش کر دیں۔ انہوں نے یقین دلایا تھا کہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر انقلابی تنظیم کی من گھڑت کہانی کو غلط ثابت کر دیں گے لیکن اس کے لئے نامزد ملزمان کی گرفتاری ضروری تھی۔

”اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتائیے کہ یہ رپورٹ سچ ہے؟“ مخالف تنظیم کے صدر نے آئی جی کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

”میرے یقین کی حد تک غلط ہے لیکن فی الوقت حالات کا تقاضا یہی ہے کہ ہم طلباء کے جذبات ٹھنڈے رکھنے کے لئے ان لوگوں کو گرفتار کریں۔“

”میری زبان زیب نہیں دیتی کہ آپ کو کوئی غلط بات کہوں لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ جب آپ خود جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے جھوٹ بولا ہے تو ایک جھوٹ کی بنیاد پر آپ کا روائی کیوں کر رہے ہیں؟ آپ عوام کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ یہ ہمیں بدنام کرنے کی اوجھی حرکت ہے اور سب سے بڑھ کر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ آپ ایک غلط کام کے لئے ہمیں قربانی کا بکرا بھی بنانا چاہتے ہیں۔“

صدر کا لہجہ خاصا تلخ تھا.....!

”کاش تمہیں میری مجبوریوں کا احساس ہوتا!“ آئی جی نے بے بسی سے کہا۔

”مجھے احساس ہے آئی جی صاحب کہ آپ پر کتنا دباؤ ہے لیکن آپ اس روایت کو توڑتے کیوں نہیں؟ آپ غلط دباؤ کو قبول کیوں کرتے ہیں؟ کسی غلط بات کے سامنے محض اپنی نوکری کے لئے سر کیوں جھکاتے ہیں؟ آئی جی صاحب! یاد رکھئے ہم کبھی اپنے ساتھیوں کو قربانی کا بکرا نہیں بنائیں گے کیونکہ ہمیں اور آپ کو بھی ایک روز خدا کے حضور پیش ہونا ہے جہاں کوئی مصلحت اور مجبوری معافی نہیں دلا سکے گی۔“ صدر کا لہجہ بڑا پر اعتماد اور جان لیوا تھا۔

آئی جی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے؟

”غیر ملکی ہاتھ“ کی کارستانی کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کیونکہ دشمن طاقتیں ایک عرصے سے ملکی سالمیت کو تہہ وبالا کرنے پر تلی ہوئی تھیں اور انہوں نے اب طلباء برادری میں بھی اپنے ایجنٹ داخل کر دیئے تھے۔

اخبارات کی خبروں سے سارے صوبے کی فضا مغموم اور مسموم ہو گئی تھی۔ لوگ حالات کی اصلیت کو جانتے بغیر اپنے اندازے قائم کر کے مفروضوں کی بنیاد پر رائے قائم کر رہے تھے۔ ایک بات پر اتفاق رائے تھا کہ یہ گھناؤنا جرم ہے اور اس کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کر کے ملزموں کو کیفر کردار تک ضرور پہنچایا جائے۔

ملک صاحب کے سامنے اخبارات کے ڈھیر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے شیطانی ذہن نے کئی منصوبے تخلیق کئے تھے جن پر وہ ایک ایک کر کے عمل کرنا چاہتے تھے۔

وہ اگلا الیکشن صرف جیتنا ہی نہیں بلکہ سرکار میں کوئی اہم منصب حاصل کرنا چاہتے تھے اور تقدیر نے سیاست کی ترپ چال ان کے ہاتھ میں دے دی تھی۔

ملک ایک بازی میں سب کوشش مات دینے کے لئے بادلا ہوا جاتا تھا۔ اس نے بڑے جبر سے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ ملکی سیاست میں بھونچال آ گیا تھا۔ نئے الیکشن شیڈول کا اعلان کسی بھی دم ہوا چاہتا تھا اور ملک کوئی نیا داؤ کھیلنا چاہتا تھا۔

اس کی شیطانی مسکراہٹ روز بروز گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے سیاست کی گندی شطرنج پر اپنے مہرے ترتیب دے لئے تھے اور بڑی سمجھداری سے اب ایک ایک چال چل رہا تھا۔

○

طلباء تنظیموں کے درمیان جنگ کی سی فضا پیدا کر دی گئی تھی۔ ملک کے مختلف کالجوں میں جہاں جہاں جس جس تنظیم کا زور چلتا تھا وہ لوگ اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ درس گاہیں میدان جنگ کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

ملک کے سب سے بڑے صوبے میں اس طرح کے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ حکومت کو اپنا اقتدار خطرے میں پڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ کی طرف سے آئی جی پر دباؤ بڑھ رہا تھا اور آئی جی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟

وزیر اعلیٰ نے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے معاملہ سنبھال لیا۔
آئی جی نے کھڑے ہو کر سر پر ٹوپی جمانی، سیلٹ کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے کانفرنس
روم سے باہر آ گئے۔ ان کے دل و دماغ سے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔
ان کی روانگی کے فوراً ہی بعد وزیر اعلیٰ نے ایک ہنگامی اجلاس شام گئے طلب کیا تھا۔
اس سے پہلے وہ خود خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹ کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔
شام گئے تک انہیں ایجنسیوں کی رپورٹ مل چکی تھی جنہوں نے آئی جی کے بیان کی
تصدیق کی تھی۔ ان لوگوں کو کوئی ایسا کلیو نہیں ملا تھا جس کی بنیاد پر وہ اس اغوا کے ذمہ دار مخالف طلباء
تنظیم کو ٹھہرا سکتے۔

وزیر اعلیٰ گہری سوچ میں ڈوبے دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ہی ان کا ماتھا ٹھکا۔
”کہیں یہ مخالفوں کی کوئی چال نہ ہو..... کہیں مخالف سیاسی پارٹی نے دونوں کو اغوا کر دیا
کر دو طلباء تنظیموں کو آپس میں ٹکرائے کا منصوبہ تو نہیں بنالیا.....!“
”بہت سنبھل کر کوئی بھی اگلا قدم اٹھانا ہو گا سر!“

ان کے سیاسی مشیر نے جو خود سابقہ سٹوڈنٹس لیڈر تھا، مشورہ دیا۔ ”دشمن نے گہری چال
چلی ہے۔ وہ ہمیں اپنی مرضی کے میدان میں لڑانا چاہتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں دشمن کی بساط
لیٹنی ہوگی، اس کے بعد ہی کچھ اور سوچیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم کسی طرح دونوں تنظیموں کو ٹھنڈا کر دو۔ میں ملک صاحب کی ڈیوٹی بھی
لگاتا ہوں۔ صرف وہی ایک آدمی ہے جو انتہائی طلباء تنظیم کو ٹھنڈا کر سکے گا۔ اگر ان لوگوں نے
ہڑتال کر دی تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔ الیکشن سر پر آ رہے ہیں اور ہمارے دوست کسی ایسے ہی
موقعے کے منتظر ہیں جب وہ ہمارے صوبے میں سیاسی اتار کی پھیلا کر اچانک وزیر اعلیٰ کا اعلان کر
دیں گے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔“
وزیر اعلیٰ نے سنبھل کر کہا۔

○

شام گئے صوبائی سیاسی لیگ کے اہم لوگ وزیر اعلیٰ کے گھر جمع تھے۔ یہ لوگ موجودہ
کرائس نے منٹنے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ وزیر اعلیٰ نے پولیس اور سیکورٹی ایجنسیوں کی

زمین نہیں پھشتی تھی کہ وہ اس میں سما جائے۔
لیکن.....!“

اچانک ہی وہ اپنی جگہ پر تن کر کھڑے ہو گئے۔
”شکریہ بیٹا! تم نے مجھے میرے فرض کا احساس دلادیا۔“

○

وہ تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر آ گئے۔ ان کا رخ چیف منسٹر ہاؤس کی طرف تھا
جہاں ایک خصوصی اجلاس امن و امان کے مسئلے پر طلب کیا گیا تھا۔

”جناب والا! میں کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ
مقدمہ جھوٹا ہے۔ کسی نے اختر اور جاوید کو اغوا نہیں کیا اور نہ ہی ان لوگوں کو کسی نے زخمی کیا ہے۔“
”آئی جی صاحب آپ کیا بات کر رہے ہیں؟“ نام نہاد ”شہری امن کمیٹی“ کے سربراہ
نے حیرانی اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے آئی جی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا آپ ہوش و حواس میں ہیں.....؟“ ایک اور صاحب غرائے۔

”جناب والا! میں جو عرض کر رہا ہوں، بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہوں۔ آپ سی آئی
ڈی والوں سے علیحدہ انکوائری کی رپورٹ مانگ سکتے ہیں۔ اس ملک میں متعدد ایجنسیاں ہیں
آپ کسی سے بھی رپورٹ مانگ سکتے ہیں۔“ آئی جی اپنے ارادے میں اٹل تھے۔

”آئی جی صاحب! آپ جانتے ہیں انتہائی طلباء تنظیم سے ہمارے سیاسی روابط کتنے
گہرے ہیں۔ اگر آپ کے ارشادات ”آن دی ریکارڈ“ آگئے تو ہماری کمر ٹوٹ جائے گی۔ ہم
نے اس شہر میں سیاست کرنی ہے آئی جی صاحب۔“ ایک وزیر باندہیر کوٹیش آ گیا.....!

”جو حقیقت تھی وہ میں نے گوش گزار کر دی۔ اس کے بعد جو حکم آپ فرمائیں۔ ہم اس
کے پابند ہیں لیکن میری درخواست ہوگی جناب والا کہ کسی غیر قانونی حکم کی تعمیل پر پولیس کو مجبور نہ
کیا جائے۔ اسی میں ہم سب کی بہتری ہوگی.....!“ آئی جی نے یہ بات براہ راست وزیر اعلیٰ کی
آنکھوں میں جھانک کر کہی تھی۔

”ٹھیک ہے.....!“ وزیر اعلیٰ نے گلا کھٹاکر کہا: ”ہمیں دوسری ایجنسیوں کی رپورٹ
بھی مل لینے دیجئے۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو سکے گا..... آپ جاسکتے ہیں۔“

بچوں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے انہیں شہر میں ایک دو جگہ ٹائر جلانے کی اجازت دے دیں..... اس سے آگے معاملہ نہیں بڑھے گا۔

جناب والا! چند روز میں روز میں انشاء اللہ میں حالات اس منہج پر لے آؤں گا کہ دونوں پارٹیوں کے لڑکے آپ کے سامنے مذاکرات کی میز پر بیٹھے ہوں گے۔ ان میں کم از کم اتنے عرصے کے لئے مفاہمت ہو جائے گی کہ ہم الیکشن کے دوران ان کی طرف سے بے نیاز رہ سکتے ہیں۔“

اپنی بات کے خاتمے پر اس نے فاتحانہ انداز میں حاضرین کی طرف دیکھا۔ وزیر اعلیٰ صاحب اس کی ذہانت کی دل ہی دل میں داد دے رہے تھے۔

”پاکھنڈی! بد معاش! سارا کھڑاک اسی سالے نے خود پھیلایا ہو گا اور اب خود ہی ”منڈیاں داما“ بن کر اپنے نمبر ٹانگ رہا ہے۔“

ایم پی اے بھنڈر نے اپنے ساتھ بیٹھے دوسرے ایم پی اے کے کانوں میں سرگوشی کی۔ بھنڈر ملک کی رگ رگ کو جھٹکتا تھا لیکن بے بس تھا اور سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن.....!

اچانک ہی ایک خیال آنے پر وہ مسکرایا۔ ”وہ مارا“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور حاضرین کو اپنی طرف مخاطب کیا۔

”ملک صاحب!“ بھنڈر نے بظاہر ملک کو چاروں شانے چت کرنا چاہا..... ”آپ اپنی تقریر میں تیسری اور سب سے اہم پارٹی کو نظر انداز کر گئے ہیں۔“

سب لوگ بھنڈر کی طرف چونک کر دیکھنے لگے۔

”میرے خیال سے دونوں اغوا کنندگان کے لواحقین کو نظر انداز کرنا بڑی بھیا تک غلطی ہوگی۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ مخالف جماعت ان کے لواحقین کو ہمارے خلاف میدان میں لے آئے اور آپ کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جائیں.....“

”بھنڈر صاحب! معافی چاہتے ہوئے عرض کروں گا کہ آپ آج بھی وہی جاگیردارانہ سیاست لئے بیٹھے ہیں جو آپ کو بزرگوں سے خنقل ہوئی تھی۔ بھنڈر صاحب! ریس میں کتے دوڑا لینے سے یا دو چار دیہاتی پنچایتوں میں دھونس دھاندلی سے قبضہ جما کر کوئی

رپورٹیں ان کے سامنے رکھ دیں۔ اب ہر کوئی حسب توفیق ان پر تبصرہ کر رہا تھا۔

یہاں جمع ہونے والے تمام ”سیاسی گدھ“ ایک ہی بات پر متفق تھے کہ ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو سرکار دربار میں ان کے لئے باعث عتاب بن جائے۔ وہ بظاہر صوبائی لیگ کے پرانے ممبران اور وزیر اعلیٰ کے انتہائی بااعتماد ساتھی تھے لیکن منافقانہ پالیسی پر سختی سے عمل پیرا تھے۔

الیکشن سرپر ہونے کے سبب انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ اس مرتبہ صوبے سے ٹکٹ جاری کرنے کے کلی اختیارات وزیر اعلیٰ کو بطور صوبائی صدر لیگ کے حاصل ہیں اور وہ اسے ہی ٹکٹ جاری کریں گے جو ان کی نگاہ ناز میں معتبر ٹھہرے گا اور وزیر اعلیٰ کی نگاہ ناز میں محترم ٹھہرنے کا ان کے نزدیک بہترین طریقہ یہی تھا کہ ان کی ہر سطح پر چالوسی کی جائے۔ یہ لوگ کوئی مشورہ دینے کے بجائے صرف بات کو آگے بڑھانے کے فلسفے پر دل و جان سے عمل پیرا تھے۔

”ملک صاحب! آپ اس ضمن میں کیا فرمائیں گے؟“

وزیر اعلیٰ نے بلاخر ”کام کے بندے“ کو متوجہ کیا۔

”میں سمجھتا ہوں جناب والا کہ یہ دشمن کی گہری سیاسی چال ہے اور اس کا مقابلہ بھی سیاسی سطح پر ہونا چاہئے۔ اگر ہم دشمن کے پھیلانے والے جال میں پھنس گئے تو پھر کبھی نہیں نکل پائیں گے..... بجائے اس کے کہ ہم دشمن کی چال کا رونا روتے رہیں، ہمیں نپلے پر دھلا مار کر انہیں منہ کے بل گراتا ہو گا۔“

لوگ ہمہ تن گوش ملک صاحب کی باتیں سن رہے تھے۔

”آپ فوری طور پر آئی جی کا تبادلہ کرنے کے احکامات جاری کر دیں۔ اس کے ساتھ ہماری طرف سے یہ بیان آئے گا کہ مضمون کی گرفتاری میں ناکام رہنے کے سبب آئی جی صاحب کی چھٹی ہوئی ہے۔ نئے آئی جی کی طرف سے مخالف طلباء تنظیم کو یقین دلادیتے کہ نہ صرف ان کے لوگوں کو گرفتار نہیں کیا جائے گا بلکہ حالات میں معمولی سی بہتری آتے ہی ان کے گرفتار شدہ ساتھیوں کو رہا کر دیا جائے گا..... انقلابی تنظیم کی طرف سے آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں لڑکوں کو سمجھا دوں گا کہ معاملہ اخباری بیانات سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ پولیس کو سمجھا دیجئے۔“

ہتھ ٹوکا

نازنین نے حسب سابق اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اس کی کوٹھے پر آمد کے ساتھ ہی وہاں ”تخلیہ“ کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔
 ”جائیں میں آپ سے نہیں بولتی۔ اتنے دن کہاں غائب رہے.....؟“ اس نے نازو
 ادا سے پان ارسلان کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
 ”اختر اور جاوید اچانک غائب ہو گئے ہیں، بس ان کی پریشانی نے ہی مصروف رکھا۔“
 ارسلان نے وضاحت کی۔
 ”ارسلان باؤ! اختر کو تو میں اتنا نہیں جانتی لیکن جاوید کے غائب ہونے کی بات سمجھ
 نہیں آتی، اسے کیا مصیبت پڑی تھی۔“
 ارسلان سمجھ گیا کہ جاوید ان لوگوں کا ”ہتھ ٹوکا“ بھی تھا اور ملک صاحب اور ان کے
 درمیان رابطے کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ اس کے ذریعے ہی یہ لوگ ملک صاحب سے
 جائز و ناجائز کام نکلوا کر رہے تھے۔ شاید براہ راست اپنے اور ان کے درمیان ملک صاحب رابطہ
 پسند نہیں کرتے تھے۔
 ”کنجروں کی دکھتی رگ“ پر ہاتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا، ارسلان نے.....!!“

سیاستدان نہیں بنا کرتا۔ خدا کے لئے سیاسی سوچ اپنائیے۔ آپ کس دور میں بیٹھے ہیں آج زمانہ
 بدل چکا ہے۔ اگر ہم اس ملک کے دو گھرانوں کو سیاسی داؤ پیچ سے قابو نہیں رکھ سکتے تو ہمیں سیاست
 کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بھنڈر صاحب! پیسے کی طاقت آپ سے زیادہ کون سمجھتا ہوگا۔ میں
 نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے۔ یہاں آنے سے پہلے اس خدشے کا تذکرہ کر کے آیا ہوں۔
 اول تو اغوا کنندگان کے لواحقین پر پیس کے سامنے ہی نہیں آئیں گے اگر آئے بھی تو ہمارے
 دوست بن کر آئیں گے دشمن بن کر نہیں۔ بھنڈر صاحب! ہم آپ جیسے بڑے جاگیردار نہیں ہیں۔
 آپ کی طرح ہم مویشیوں کی اعلیٰ نسل تو نہیں رکھتے لیکن ہمارے پاس ہوشیار و رور کروں کی ایک فوج
 ضرور موجود ہے اور وہی ہماری سیاسی طاقت ہے..... یوں بھی ہارس اینڈ کیمل شو میں انعام حاصل
 کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آدی سیاسی میدان میں بھی اول آئے۔“

ملک کی آخری بات پر وہاں موجود اس کی ”خاص لابی“ نے زوردار تہقیر لگایا تھا۔

بھنڈر کے سامنے زمین نہیں پھٹتی تھی کہ وہ اس میں سما جاتا۔ اس کے چہرے پر ایک

رنگ آ اور جا رہا تھا۔

جہانم دیدہ وزیر اعلیٰ نے معاملات بگڑنے سے پہلے حالات کو سنبھالنے کے لئے آگے
 بڑھ کر بھنڈر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میٹنگ ختم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے سب کو کھانے کی
 میز پر آنے کی دعوت دی۔ کسی بد مزگی سے بچنے کے لئے وزیر اعلیٰ نے ایم پی اے بھنڈر کا ہاتھ ابھی
 تک تھاما ہوا تھا اور اسے اپنے ساتھ کھانے کی میز تک لائے تھے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے
 حصے کی بوٹیاں پلیٹ میں ڈالیں اور آہستہ آہستہ باقی لوگوں میں گھلتے ملتے ملک صاحب کے پاس
 جا کر کھڑے ہو گئے۔

ملک صاحب جیسے شاطر کو ہاتھ سے کھونا اپنی سیاسی قبر اپنے ہاتھوں کھودنے کے
 مترادف تھا۔ بھنڈر جیسے دس گدھے انہیں مل سکتے تھے لیکن ملک جیسا چالاک بھیڑیا مشکل ہی سے
 ہاتھ آتا ہے۔

وزیر اعلیٰ جانتے تھے کہ اپنی پارٹی میں موجود ایک مضبوط مخالف گروپ کی موجودگی میں
 ملک صاحب جیسے لوگوں کو ہاتھ میں رکھنا ان کے لئے ناگزیر ہے۔



پھر تو بات ہوئی ناں.....!“ اس نے نازنین پر نیدے کتوں کی طرح جھپٹتے ہوئے کہا۔
 ”تم کتنے عظیم ہو ارسلان باؤ.....!“ نازنین اس پر مٹی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی
 ”خاندانی شرم و حیا“ کو مکمل ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے چند منٹ میں ہی ارسلان کو عیش و نشاط کی ان
 وادیوں میں پہنچا دیا کہ اس کا رواں رواں سرشار ہو کر مستی سے ناچنے لگا۔
 یہ مہر کہہ کر کرنے کے بعد اس نے خود کو سنبھالا اور مسکراتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی
 گئی۔

”میں کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔“

”یہ لو..... کسی کو بھیج کر منگوالو۔“

ارسلان نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کو تھما دیا۔ اس کو اپنا وجود ہوا میں اڑتا ہوا محسوس
 ہو رہا تھا۔ صوفے پر ٹیک لگائے وہ آنکھیں بند کئے مدھوشی کے سے عالم میں بیٹھا تھا جب نازنین
 کی ماں مختار ماں بائی اندر داخل ہوئی۔

اس نے کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے ہی ارسلان کی بلائیں لینا شروع کر دی تھیں۔
 ایک ایک فقرے سے ہزار ہزار مطلب ادا کرتی وہ باؤ ارسلان پر مٹی جا رہی تھی اور اس کے اتنے
 دن نہ آنے پر زبردست شاک تھی۔

”بی بی! تم بے فکر ہو جانا۔ ملک صاحب اپنے بندے ہیں۔ کوئی کام ہو تو بلا جھجک
 بتانا..... بی بی اگر تمہارا کام نہ کروا سکے تو یہ شہر چھوڑ جائیں گے۔“ اس نے شراب کا گلاس ہاتھ میں
 پکڑتے ہوئے کہا۔

بی بی نے اس کے لئے خاص طور سے پیگ تیار کیا تھا۔ دونوں نے اگلے روز ہی
 ملاقات کا وقت طے کر لیا۔ ارسلان نے کہا تھا کہ وہ انہیں فون کر کے بتا دے گا۔

میراثی کھانے کا خوان اٹھائے کمرے میں آ رہا تھا۔ اس کے تعاقب میں آ رہی تھی
 نازنین.....!

اپنے ناز و ادا کی بجلیاں گراتی..... شراب اور شباب کے نشے نے ارسلان کو دنیا و مافیہا
 سے بے خبر کر دیا تھا۔

بی بی اٹھ کر چلی گئی۔ میراثی اپنا انعام لے کر رخصت ہو گیا۔ دونوں نے کھانا کھایا اور

”کیا بات ہے حضور! کوئی پریشانی آن پڑی ہے کیا؟ ہمیں حکم دے کر دیکھیں۔“ اس
 نے نازنین کو جھپٹنے سے اپنے اوپر گراتے ہوئے کہا۔

”نہیں! بس.....!“ وہ جھپٹنے کی اداکاری کر رہی تھی۔

”نازنین! کھل کر بات کرو۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟“

”دراصل تم تو جانتے ہی ہو آج کل بازار کے حالات کیسے ہیں۔ آئے روز پولیس
 والے تنگ کرتے ہیں۔ جاوید ملک صاحب کے ذریعے ذرا ان لوگوں کو سیدھا رکھتا تھا۔ ہم غلط
 لوگ نہیں ہیں ارسلان باؤ.....!“ اس کا لہجہ بدلنے لگا تھا۔

”قسمت نے اس بازار میں پہنچا دیا ہے۔ ہم کوئی پیشہ ور لوگ نہیں خاندانی لوگ ہیں۔
 تم جانتے ہو اس کوٹھے پر کوئی ادا باش آدمی قدم نہیں دھر سکتا۔ پولیس کا اس طرف آنا ٹھیک نہیں.....
 سنا ہے نیا ڈی ایس پی آیا ہے۔ کچھ زیادہ ہی ”تھتھ جھٹ“ لگتا ہے۔ کل بی بی نے اپنے میراثی کو
 تھانے ”سلام“ کرنے بھیجا تھا لیکن اس نے بی بی کا بھیجنا نہ قبول کرنے کے بجائے التامیراٹی
 کو بے عزت کر کے نکال دیا..... صبح انپکٹر آیا تھا بی بی کے پاس۔ اللہ بھلا کرے بے چارے کا
 ہمارا بہت خیال رکھتا ہے۔ اس نے بی بی سے کہا تھا کہ آئندہ براہ راست کچھ بھیجنے کی جرأت نہ
 کرنا۔ آدمی بڑا ہوشیار ہے۔ تمام کوٹھوں والے کونسلر کے ذریعے ہی اس سے ”صاحب سلامت“
 رکھتے ہیں۔“ اس نے رک کر گہرا سانس لیا۔

”تم بھی کونسلر کے ذریعے.....!“ ارسلان نے کچھ کہنا چاہا۔

”یہی تو مصیبت ہے.....! نازنین اس کی بات کاٹ کر بولی.....“ تم نہیں جانتے بی
 بی مر جائے گی لیکن اس کونسلر کے منہ نہیں لگے گی۔ وہ حرامی یہی تو چاہتا ہے کہ ہم اس کی جو کھٹ پر
 پہنچ کر سجدہ ریز ہوں ہاں..... انپکٹر کہہ رہا تھا کہ اگر ملک صاحب ڈی ایس پی کو کہہ دیں کہ کسی کی
 ہمت نہیں کہ مختار ماں بائی کے کوٹھے کی طرف آنکھ بھر کے بھی دیکھ سکے لیکن ملک صاحب کو براہ
 راست کچھ کہنے کی ہمت ہم غریبوں میں تو نہیں ہے۔“

اس نے پریشان ہونے کی اداکاری کی۔

”بس اتنی سی بات ہے..... ارے تم فکر ہی نہ کرو۔ میری جان! میں تمہیں خود ملک
 صاحب کے پاس لے جاؤں گا اور اس ڈی ایس پی کو وہیں بلا کر تمہارے سامنے کرواؤں گا.....“

تھی وہی تاریخ اب ملک صاحب کے سامنے دہرائی جا رہی تھی۔
”بھئی ہم تمہیں بنائیں گے اس قابل۔“

ملک صاحب اپنی جگہ سے جھومتے ہوئے اٹھے اور نازنین کا بازو پکڑ کر اپنے پہلو میں
بٹھالیا۔

”ارسلان..... تم جاؤ بیٹا۔ شام کو چھوڑ آنا ان لوگوں کو.....!“

ملک صاحب نے اچانک ہی ارسلان کی موجودگی کو کباب میں ہڈی جان کر اسے کہا
تھا۔

ارسلان کو آج زندگی میں پہلی مرتبہ بڑی شدت کے ساتھ اپنی بے عزتی کا احساس
ہوا۔ اسے نازنین پر بہت غصہ آ رہا تھا جو ملک کے پہلو میں یوں چٹ کر بیٹھی تھی جیسے ارسلان کے
پہلو میں بیٹھی ہو۔

O

بڑے جبر سے اس نے اپنے چہرے کے تاثرات چھپائے اور بے شرمی سے دانت
نکالتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

یہ ملک صاحب کی رہائش گاہ تھی جہاں بہت خاص قسم کے لوگوں کو ہی قدم رکھنے کی
اجازت ملا کرتی تھی۔ یہاں ان کی نو بیاہتا بیوی رہتی تھی۔ یہ ملک صاحب کی ”آن دی ریکارڈ“
تیسری شادی تھی جو انہوں نے اپنی بیٹی کی عمر جتنی ایک استانی سے رچائی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ ملک
صاحب کی موجودہ بیوی کسی سفارش کے لئے ملک صاحب کے کسی گرگے کے ذریعے ان سے
نکرائی اور ملک صاحب نے حسب عادت اسے ”معمول کا شکار“ سمجھ کر ”کھیلایا“ تھا لیکن یہ کھیل
اسے بڑا مہنگا پڑا۔ استانی نے دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں
کیا تو وہ انہیں بنگا کر دے گی۔

”ملک صاحب! میں تو مٹ ہی چکی ہوں لیکن آپ کی داشتہ بن کر زندہ رہنے کی
 بجائے میں مرجانا پسند کروں گی..... اور ہاں اگر آپ اس چکر میں ہیں کہ مجھے غائب کروادیں تو
بھول جائیں..... اگر مجھے کچھ ہو گیا تو آپ کے اور میرے ناجائز تعلقات کی کہانی ملک کے
سارے اخبارات میں چھپ جائے گی۔ میں نے اس کا بندوبست کر لیا ہے۔“

اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔ صبح تک نازنین نے اس کے ساتھ ایسے ایسے داؤچ کھیلے
کہ اب اس کے لئے نازنین کے کمرے کی سر تابی کی مجال ہی نہیں تھی۔

O

تیسرے دن شام کو وہ نازنین اور مختار اب بی بی کو ملک صاحب کے حضور ”سلام
کروانے“ لے جا رہا تھا۔ یہ لوگ ملک صاحب کے لئے اجنبی نہیں تھے لیکن آج تک براہ راست
ملک صاحب کے سامنے آنے کی جرأت انہوں نے نہیں کی تھی حالانکہ ”برے بھلے وقت“ میں
ملک صاحب کے حکم پر مختار اب بائی ہی ان کے لئے مال سپلائی کیا کرتی تھی۔

مختار اب بائی پر ارسلان کا پہلا حملہ ہی بڑا زوردار تھا۔

جاوید نے شاید اس خوف سے دونوں پارٹیوں کو آپس میں نہیں ملایا تھا کہ کہیں درمیان
سے اس کا پتہ ہی نہ کٹ جائے اور یہ لوگ اسے مکھن سے بال کی طرح نکال کر الگ رکھ دیں۔
لیکن.....!

ارسلان کو کوئی ایسا خوف یا فکر دامن گیر نہیں تھا۔

وہ جب چاہتا بازی کو الٹ سکتا تھا..... اسے جوڑو کی سیاست کی خاصی سمجھ آنے لگی
تھی۔

”کیا حال ہے مختار اب بائی! ارسلان تمہاری بڑی سفارش کرتا ہے۔ کیا جادو کر دیا ہے
لڑکے پر؟“ ملک صاحب نے انہیں اپنے خاص ڈرائنگ روم میں طلب کیا تھا اور یہاں وہ ایک
مکمل بدلا ہوا انسان تھا.....!

مختار اب بائی اور اس کی بیٹی نازنین نے ملک صاحب کو اتنا جھک کر اور مغلیہ انداز سے
فرشی سلام کیا تھا کہ ارسلان کو خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

دونوں ماں بیٹی نے اپنے جسمانی خطوط کی نمائش میں ایک دوسری کو مات دینے کی ہر
ممکن کوشش کر ڈالی تھی۔

”ارے ادھر آؤ شہزادی تم کہاں جا رہی ہو؟“ ملک صاحب نے لپچائی ہوئی نظروں
سے نازنین کے جسمانی خطوط کو گھورا اور اپنے نزدیک بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”شکریہ جناب! ہم اس قابل کہاں ہیں؟“ نازنین جو کچھ ارسلان کے سامنے کیا کرتی

اس نے ایک روز ملک صاحب کی خواب گاہ میں لیٹے ہوئے انہیں دھکی دی تھی۔

ملک صاحب نے دنیا دیکھی تھی.....!

وہ بات کرنے والے کا وزن کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بھونکنے اور کاٹنے والے کتوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہ تو خود ایک ایسی ہی ”سیکرٹری نمائیوی“ چاہتے تھے جس کے ساتھ سوشل تقاریب میں شرکت کر سکیں۔

آئے روز انہیں غیر ملکی سفارت خانوں میں مختلف تقاریب میں شرکت کرنا ہوتی تھی اور جس سوسائٹی سے وہ اپنا تعلق جوڑ چکے تھے وہاں بوڑھے سیاستدانوں کی نوجوان بیویاں ان کے لئے ترقی کے ایسے زینے بن جایا کرتی تھیں جن کے ذریعے وہ سالوں کا سفر دنوں میں طے کر لیا کرتے تھے۔

ملک صاحب سیاست کے ہر میدان میں اپنے پاس مضبوط گھوڑے رکھتے تھے لیکن ”سوشل لائف“ کے لئے کسی جاندار گھوڑی کی وہ شدت سے محسوس کرتے تھے۔

ایسی دلیر اور بے باک عورت ان کے بہت سے کام آسان کر سکتی تھی۔ جس جرأت سے اس نے ملک صاحب کو چیلنج کیا تھا اس ”ادا“ نے ملک صاحب کو اپنا گرویدہ بنا دیا.....! انہوں نے بڑی خاموشی سے ایک سادہ سی تقریب میں نکاح پڑھوایا۔

اس شادی کا انکشاف ایک اخبار کے رنگین صفحات پر اچانک ہی ملک صاحب اور ان کی نو بیاہتا بیوی کے مشترکہ انٹرویو سے ہوا جس میں مسز ملک نے کہا تھا کہ ملک صاحب کی سیاسی خدمات کی وجہ سے ان پر لٹو ہو گئی تھی اور اس نے ملک صاحب کے ”عظیم مشن“ میں ہاتھ بٹانے کے لئے ان کے ساتھ شادی کی ہے۔ ملک صاحب نے کہا تھا کہ انہیں مسز ملک کے جذبہ خدمت نے بہت متاثر کیا اور انہیں زندگی میں بہترین سماجی اور سیاسی رفاقت میسر آئی ہے۔ دونوں میاں بیوی پہلے سے بڑھ کر قوم کی خدمت کریں گے۔

مسز ملک غریب گھر کی پڑھی لکھی اور ہوشیار لڑکی تھی۔ اس نے غربت کے ماحول میں جنم لے کر زندگی کو اپنی دہلیز پر بوجہ ریز کرنے کے خواب دیکھے تھے۔ وہ بھی کسی ایسے ہی ”پائیدان“ کے چکر میں تھی جس پر پاؤں رکھ کر وہ کامرانوں کی سپرائیکسپریس میں سوار ہو سکے۔

دونوں اپنی اپنی جگہ داؤ کھیل کر ایک دوسرے کو بیوقوف اور خود کو عقل مند سمجھ رہے

تھے۔

دونوں..... ہی اپنی دانست میں ایک دوسرے کو ”شکار“ کر چکے تھے۔

مسز ملک کی نظر میں ملک صاحب کی شہرت سے زیادہ ان کی دولت پر تھیں۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے نہ صرف یہ کوشش اپنے نام لکھوائی تھی بلکہ اپنا الگ اکاؤنٹ بھی کھول لیا تھا اور آج کل تو ایکشن نزدیک ہونے کی وجہ سے وہ صوبائی سیاسی لیگ کی خواتین برانچ میں بھی سرگرم تھیں۔

اپنے گھر میں کسی طوائف کی آمد کو مسز ملک نے نیک فہم نہیں جانا تھا۔ وہ ملک صاحب کی ہر حرکت سے باخبر رہنا چاہتی تھی۔ پردے کی اوٹ سے اس نے ارسلان کی بے بسی کا نظارہ کر لیا تھا اور اس کی جہاندیدہ نظروں نے ارسلان اور طوائف زادی کے ”تعلق“ کی سنگینی بھی محسوس کر لی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اس کے بہتر مستقبل کا انحصار اس کی بہتر ”باخبری“ پر ہے۔

○

”ظہر و.....!“

ارسلان کو اچانک ہی پشت سے آنے والی نسوانی آواز نے چونکا دیا۔

”جی.....!“ اس نے گردن موڑی تو مسز ملک سامنے کھڑی تھی۔

”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں.....!“ مسز ملک نے لگی لپٹی رکھے بغیر اس

کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

ارسلان کے اندر کا شیطان انگڑائی لے کر جاگ اٹھا۔

”وہ مارا!“ اس کا دل بلیوں اچھلا۔

”اچھا ملک صاحب تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ تمہارے نزدیک کیا انسانوں کی قیمت کتنی

جتنی بھی نہیں۔ سالا! نازنین پر بھی قبضہ جمالیا..... جیسے میری اپنی کوئی زندگی ہی نہیں جیسے میں اس

کا زرخیز غلام ہوں..... میں دیکھوں گا ملک صاحب کہ تم میرا کیا بگاڑ لو گے..... تمہیں اس گستاخی

کی قیمت بہر صورت ادا کرنی ہوگی.....!“ وہ خود کو سراٹا کر سمجھنے لگا۔

○

مزملمک ماہر نفسیات کی طرح اس کی مردانگی پر مسلسل ضربیں لگا کر اس کے لاشعور میں تڑپتی انتقام کی آگ کو بھڑکار رہی تھی۔

”میں اتنا بزدل بھی نہیں جتنا آپ نے سمجھ لیا.....!“ اس نے حوصلہ دکھایا۔

”اس گھر میں صرف ایک نوکرانی کام کرتی ہے یا پھر ایک باڈی گارڈ۔ دونوں میرے بندے ہیں..... بنے فکر رہنا۔ اپنے ذہن کو سکون دے لو..... میں تم سے جو بات کروں گی مکمل رازداری اور ضمانت کے ساتھ کروں گی..... گھبراتا نہیں..... ممکن ہے تمہارے نزدیک ملک کسی وحشی درندے کا نام ہو لیکن تم نے سرکس میں اس شیر کو دیکھا ہو گا جس کے منہ میں بکری کی گردن دے دی جاتی ہے اور وہ کچھ نہیں کر پاتا۔“

ایک لمحے کے لئے رک کر مزملمک نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”سگریٹ پیتے ہو.....؟“ اس نے سگریٹ کی ڈبیہ سے ایک سگریٹ نکال کر اس کی

طرف بڑھایا۔

”جی نہیں۔“

”گلدھے ہوتم..... شراب پی لیتے ہو سگریٹ نہیں پیتے۔“ مزملمک نے لائٹ سے اپنا سگریٹ سلگا کر ڈیہامیز پر پھینک دی۔

ارسلان مسریم زدہ معمول کی طرح اس کا مطیع ہو رہا تھا۔

”یہ سارا اکمال ٹرینر کا ہوتا ہے..... بے فکر ہو میں نے اپنے معاملات کی حد تک اس

شیر کے دانت نکال دیئے ہیں۔ وہ میرے سامنے صرف سرکس کا شیر ہے..... اور بس!“

مزملمک نے چند منٹ میں اس کے لاشعور سے ملک صاحب کا خوف اکھاڑ کر باہر

پھینک دیا تھا۔

”دیکھو ارسلان! میرا اور تمہارا ایک رشتہ ہے، بہت مضبوط رشتہ۔“ اس نے سگریٹ کے

دھوئیں سے مرغولے بناتے ہوئے کہا۔

ارسلان نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مظلومیت کا رشتہ..... میں اور تم دونوں بہت مظلوم اور زخم خوردہ ہیں۔ مجھے تمہارے

ماضی کا پورا علم ہے۔ شراب کے نشے میں ملک نے تمہارے متعلق سب کچھ مجھے بتا دیا تھا۔ وہ خود

”فرمائیے.....!“ اس نے مزملمک کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

اتنے نزدیک سے اس نے پہلی مرتبہ انہیں دیکھا تھا۔ اس کے حسن اور ذہانت کے چرچے سن کر ارسلان بھی یہی سوچا کرتا تھا کہ ملک صاحب نے ضرور اس کو بھی بلیک میلنگ سے قابو کر رکھا ہے..... ورنہ ایسی خوبصورت اور ذہین عورت کو اس بڑھے کھوسٹ کے کھونٹے سے بندھے رہنے کا شوق کیوں کر ہونے لگا۔

”تم ارسلان ہو؟“

اچھا میرا نام بھی جانتی ہے۔ عورت ہوشیار معلوم ہوتی ہے۔ اس نے سوچا۔

”جی!“

”مجھے جانتے ہو؟“ اس نے ایک خاص ادا سے ماتھے پر گری لٹوں کو ہٹایا۔

”جی! آپ مزملمک ہیں۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے ارسلان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ سحر زدہ معمول کی طرح اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اپنی خواب گاہ کے دروازے پر رک کر

اس نے دروازہ کھولا۔

”ادھر آ جاؤ۔“

”جی.....!“ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

اچانک ہی ملک صاحب کی دہشت اس کے راستے کی دیوار بن گئی۔ اگر ملک صاحب

کو علم ہو گیا؟ اس نے سوچا اور لرز کر رہ گیا۔

”گھبراؤ نہیں۔ یہ میرا اور تمہارا معاملہ ہے۔ ملک درمیان میں نہیں آئے گا۔“ مزم

لمک نے اس کے دل کا چور پکڑ کر اسے تسلی دی۔

”میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔“ اس نے ارسلان کی مردانگی پر

چوٹ لگائی۔

”اچھا یہ بات ہے!“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور اندر داخل ہو گیا۔

”وہ رات سے پہلے کمرے سے باہر نہیں نکلے گا اور رات کو بھی صرف اس طوائف کی

ماں باہر آئے گی تاکہ تم اسے واپس اس بازار میں چھوڑ آؤ جہاں سے لے کر آئے تھے۔“

”اچھا سوال کیا ہے تم نے..... لیکن اس سے پہلے ملک صاحب کا ”ضرورت مند خواتین“ سے ہی واسطہ رہا ہے..... جیسے میں..... کسی پیشہ ور طوائف نے آج تک اس گھر کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا اور یہ لوگ ”ضرورت مند“ بھی دکھائی نہیں دیتے۔ اس لئے میرا چونکنا فطری بات ہے۔ مجھے علم ہے تمہیں اس طوائف سے محبت ہے یا پھر اس نے تمہارے ساتھ محبت کا ڈھونگ رچایا ہے۔ میں جانتی ہوں جب نوجوان عورت اور مرد ایک دوسرے کے جسمانی تقاضے سمجھنے لگیں تو اس منافق معاشرے میں اس رشتے کو بھی ”محبت“ کا نام دے لیتے ہیں۔ ”اپنی ہاؤ“ میں تمہیں الزام نہیں دے رہی ہوں نہ ہی مجھے کسی بحث میں پڑنے کی ضرورت ہے۔ ہر آدمی کو اپنے نظریات کے ساتھ جینے کا حق ہے لیکن تم ایک مشرقی مرد ہو۔ اس سے پہلے تم نے ایک ”اچھی عورت“ ہما اکبر شیروانی کو ملک صاحب کے ساتھ اپنے تعلقات کی بھینٹ چڑھایا اور اب پھر ملک تمہارے منہ سے نوالہ چھین رہا ہے..... تم آخر تک اس بوڑھے سیاستدان کی لاشیں بنے رہو گے؟“

اس نے اب دوسرا سگریٹ سلگا لیا تھا۔ اس کی بات کے آخری فقرے سے ارسلان کے ذہن کے سارے تار جھنجھٹا اٹھے تھے۔

”کیا مطلب ہے آپ کا.....؟ معاف کیجئے مجھے آپ کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ آپ ایک شادی شدہ خاتون ہو کر.....“

”یہ ایک سیاسی شادی ہے۔“ اس نے ارسلان کی بات کا نٹے ہوئے کہا۔

”میری کہانی تم سے مختلف نہیں لیکن فرق اتنا ہے کہ میں نے عورت ہو کر بھی اپنے لئے کی قیمت وصول کر لی اور تم مرد ہو کر بھی.....“ اس نے بات نامکمل چھوڑ دی تھی۔

”ٹھہرو میں تمہارے لئے کچھ پیسنے کو منگواؤں۔ اتنا کہہ کر وہ ارسلان کو چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

شاید اس تنہائی میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقعہ دینا چاہتی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے ارسلان کی مردانگی پر آخری اور جان توڑ حملہ کیا تھا۔

واقعی وہ اس حملے سے نہ سنبھل سکا۔

اس نے سوچا۔ مزر ملک نے کتنی صحیح بات کہہ دی۔ ملک کا ”تھوڑا“ بن کر اس نے زندگی میں کیا کچھ نہیں کھو دیا تھا۔ اپنا گھر یا ماں باپ، بہن بھائی، ہما اکبر شیروانی اپنا کیرئیر حتیٰ کہ

ہی بولنے لگا تھا۔ میں نے نہیں پوچھا۔ میں تو تمہیں تب تک جانتی بھی نہیں تھی..... پھر میں جان گئی کہ تمہیں جکڑے رکھنے کے لئے اس نے کون کون سا حربہ استعمال کیا لیکن یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی۔ اس دنیا میں ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ شاید کمزوروں کے لئے یہ دنیا بنی ہی نہیں..... بہر حال ہم چاہیں تو ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں کیونکہ ہم دونوں کا مسئلہ قریباً ایک جیسا ہے..... زندگی کی دوڑ میں تم بھی آگے بڑھنا چاہتے ہو اور میں بھی لیکن ہم الگ الگ سمتوں میں بھاگ رہے ہیں.....!!“

ارسلان مبہوت اس کی باتیں سن رہا تھا۔

یہ عورت اس کے لئے مکمل ناقابل سمجھ تھی۔

اس نے ارسلان کو موقعہ ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اس کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکتا۔ یہ گداڑ جسم والی سانولے رنگ کی عورت جس کی آنکھوں میں اسے اپنا آپ ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا، بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگا کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔

اپنی خواب گاہ میں تمام خدشات اور خوف سے بے نیاز اس عورت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے دوسروں سے الگ اور ممتاز کر رہی تھی۔ ارسلان نے ملک صاحب کا دامن تھامنے کے بعد اب تک عورت کا گوکہ ایک ہی روپ دیکھا تھا، اس روپ کی بے شمار عورتوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔

لیکن.....!

ایسا کچھ تھا جو ارسلان کو اس کی عزت کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

”یہ جو طوائف ملک صاحب کو ملنے آئی ہے اس کا نام کیا ہے؟“

اب وہ مطلب کی بات پر آگئی۔

”نازنین..... یہ مشہور طوائف مختار اس بائی کی بیٹی ہے۔“ ارسلان نے بغیر کسی

ہچکچاہٹ سے کہہ دیا۔ ”ایک بیوی ہونے کے ناطے آپ کو اپنے شوہر کی پرائیویٹ لائف میں جھانکنے کا حق تو حاصل ہے۔ میں اس حق کو چیلنج نہیں کرتا لیکن معاف کیجئے ایسا پہلی مرتبہ تو نہیں ہوا۔ یہ تو آپ بھی جانتی ہیں کہ ملک صاحب عورتوں سے کچھ زیادہ ہی شغف رکھتے ہیں۔“ اس نے بھی اب کھلتا شروع کر دیا تھا۔

پرتیار..... اسے اتنی بڑی آفر دینا کہ اس کے پاس ”ناں“ کی گنجائش ہی نہ رہ جائے۔“

”مثلاً..... کتنے تک.....!“ ارسلان نے بڑے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

”ایک لاکھ دو لاکھ!“

”میں جانتا ہوں اتنی رقم کے لئے وہ ملک صاحب کو زہر دینے پر راضی ہو جائے گی لیکن

اتنی رقم کیا اسے.....“

”کون بیوقوف اتنی رقم اسے دے گا اتنے معمولی کام کے لئے..... اسے تو وہی ملے گا

جو ایڈوائس دے دو گے۔ اس کے بعد جب اس کی تصاویر ملک کے ساتھ بن جائیں گی تو اس کی

جرات نہیں کہ باقی رقم طلب کر سکے اور سب سے بڑی بات کہ پھر وہ کبھی تمہارے چنگل سے بھی

نہیں نکل سکتی کیونکہ وہ پھر اس کھیل کی فریق بن چکی ہوگی۔“

ارسلان کا سر چکرا کر رہ گیا.....!

اتنی ہوشیار عورت تھی یہ..... اور کتنی لاپرواہی سے بات کر رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا

تھا سبز ملک کے ساتھ مل کر کام کرنے کا..... اپنی محرومیوں کا بدلہ لینے کا۔ مکر و فریب اور ریاکاری

کے جس طلسم ہوشربا میں وہ داخل ہو چکا تھا اس کے تمام اصول اور ضابطے ارسلان پر بھی اسی طرح

نافذ العمل تھے جیسے اس دنیا کے دیگر مکینوں پر.....!

اس دنیا کا اپنا ”کوڈ آف کنڈکٹ“ تھا.....!

اس ”کوڈ آف کنڈکٹ“ کی پاسداری اس پر لازم تھی۔



اپنا آپ بھی..... وہ اب ایک عام شہری نہیں تھا، قانون کا باغی، قانون کو مطلوب.....!

کب تک اس کے جرائم پر پردہ بڑا رہے گا۔

کب تک وہ اپنی آنکھوں سے اپنے لئے کا تماشا دیکھے گا۔

”ٹھیک ہے.....!“ اس نے سوچا..... ”ملک صاحب نہیں تو سبز ملک ہی سہی۔ یہاں

کم از کم برابری کی بنیاد پر تو معاملہ چلے گا۔ وہاں تو وہ اپنی مرضی سے کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور

سب سے بڑھ کر تو یہ بات تھی کہ وہ یہاں ”مجبور محض“ نہیں تھا۔“



سبز ملک کی واپسی چائے کی ٹرائی کے ساتھ ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر

اسے پیش کی تھی۔

”مجھے امید ہے کہ تمہارا فیصلہ وہی ہوگا جو ایک عقل مند انسان کا ہونا چاہئے۔ تم میرے

لئے کام کرو۔ میری اپنی سیاسی پارٹی ہے اس کے لئے کام کرو۔ تمہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں

ہونی چاہئے کہ میرا اور ملک کا رشتہ کیا ہے۔ تم یہی سمجھو کہ اب تمہارا اور میرا تعلق کیا ہے.....؟ اس

تعلق کو ہم دونوں اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر مضبوط کرتے رہیں گے۔ ہاں میں تمہیں یہ ضرور یقین

دلاتی ہوں کہ کامیابیوں میں تمہارا اور میرا حصہ فغنی فغنی ہوگا..... میں اس کا گھپلا نہیں کروں گی۔

غنیمت کی تقسیم ایمان داری سے ہوگی.....!“ اس نے چائے کا گھونٹ حلق میں اٹھایا۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ ارسلان نے پوچھا۔

”شاباش! فی الحال تم دو محاذوں پر کام شروع کر دو گے۔ تین روز بعد بھارتی سفارت

خانے کی ایک تقریب میں ملک شامل ہوگا۔ اس مرتبہ تم بھی وہاں جاؤ گے۔ اپنی آنکھیں اور کان

کھلے رکھنا زبان بند۔ تمہیں بہت کچھ دیکھنے سننے کو ملے گا۔“

”اور دوسرا کام.....؟“

”نازنین کو تیار کرو۔ ملک اس کی بوئیاں ابھی کچھ روز مسلسل نوچے گا۔ اس دوران اگر

وہ ہماری مدد کرے اور شراب کے نشے میں دھت ملک صاحب کے ساتھ تصاویر بنانے میں مدد

کرے تو اسے منہ مانگی قیمت مل جائے گی.....!“

ٹھہرو..... ابھی کچھ نہ کہنا۔ یہ پروفیشنل لوگ ہیں۔ دولت کے لئے سب کچھ کر گزرنے

چوہدری غلام رسول کچھ کہتا، ایس ایس پی نے فون پر ایک نمبر گھمانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹھنٹی بجا کر اپنے گارڈ کو اندر بلا لیا۔

”میاں صاحب کو بھیج دو۔“ انہوں نے گارڈ کو حکم دیا۔

چوہدری صاحب نے ان میاں صاحب کو آج دوسری مرتبہ دیکھا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ ایم این اے صاحب کا حکم لے کر آئے تھے اور آج دوسری مرتبہ اس وقت نظر آئے جب چوہدری کا ”بادلہ“ ہو چکا تھا۔

میاں صاحب نے ایس ایس پی صاحب کو تو صرف سلام کیا تھا مگر چوہدری غلام رسول سے بڑی گرمجوش سے مصافحہ کر کے اس کی خیریت بھی دریافت کر لی تھی۔

چوہدری کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس ٹھنٹی سی عفریت کا ٹینو ادا بادے۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے میاں صاحب کو گھورا اور سیلوٹ مار کر باہر نکل گیا۔

اسے چارج سنبھالے آج تین مہینے ہونے کو آئے تھے لیکن اس دوران سوائے چھ ”فورٹ ٹائپ“ (پندرہ روزہ خفیہ رپورٹ) لکھنے کے اس نے اور کچھ نہیں کیا تھا۔ ”سٹوڈنٹس ونگ“ اسے سونپا گیا تھا۔ ایک انسپکٹر اور تین چار ماتحتوں کے ساتھ اسے حکم دیا گیا تھا کہ طلباء سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔

چوہدری غلام رسول نے پولیس میں حکومت کرنے کے ڈھنگ دیکھے تھے۔ وہاں دن میں جانے کتنے مرتبہ رعب جھاڑنے اور اپنی انا کو تسکین دینے کے مواقع میسر آتے تھے۔ چوہدری صاحب کو شاید ہی اپنی پولیس سروس کے درمیان سبزی گوشت اور فروٹ خریدنے کی نوبت آئی ہوگی۔

مگر یہاں گنگا لٹی بہہ رہی تھی۔

جب سے چوہدری صاحب آئی بی میں آئے تھے، گھر کی رونقیں ہی اجڑ کر رہ گئی تھیں۔ کوئی سابقہ ماتحت اچانک سامنے آ جاتا تو سلام دعا ہو جاتی ورنہ تو کوئی انہیں ملنے بھی نہیں آتا تھا۔ ایک وہ دور تھا جب یہ لوگ قطار باندھ کر ان کے گھر سے باہر دست بستہ کھڑے ہوتے تھے۔ اب تو سبزی گوشت کے لئے بھی مسز چوہدری کو نوکر بھیجا پڑا تھا۔ پھر حالت یہ ہو گئی کہ نوکر کی بہرا پھیری سے تنگ آ کر وہ خود بازار جانے لگیں۔

قربانی کے بکرے

چوہدری غلام رسول اس وقت کوکوس رہا تھا جب اس کا دماغ خراب ہوا اور اس نے ڈی ایس پی کی حیثیت سے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اپنے علاقے کے ایک ہیروئن فروش کو گرفتار کر کے اس کے قبضے سے اچھی خاصی ہیروئن کی مقدار بھی برآمد کر لی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ یہ شخص ”اوپر تک“ جاسکتا ہے۔

پہلی سفارش ہی مقامی ایم این اے کی آئی لیکن چوہدری غلام رسول کوئی ایسا گرا پڑا پولیس افسر نہیں تھا کہ وہ ایم این اے سے دب جاتا۔ یہاں تو وزیروں کی فوج موجود تھی جن کو کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ پرانا پولیس افسر ہونے کے باوجود وہ اندازہ نہ لگا سکا کہ یہ ایم این اے ذرا ”وکھری ٹائپ“ کا تھا جس نے راتوں رات چوہدری صاحب کو تارے دکھادیئے۔

اگلے روز جب ایس ایس پی کے ہاں پیشی ہوئی تو چوہدری صاحب نے اپنی دانست میں بڑا مضبوط کیس تیار کر رکھا تھا لیکن وہ حیران رہ گیا جب یہاں متعلقہ مسئلہ پر اس سے کچھ پوچھا ہی نہیں گیا۔

”تمہاری خدمات انٹیلی جنس بیورو کو سونپی جا رہی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم جیسے لائق اور ایماندار افسر وہاں بھی اپنے محکمے کی عزت پر آجیج نہیں آنے دیں گے۔“ اس سے پہلے کہ

گزارتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تعاون کی صورت میں آپ مرکزی حکومت کی طرف سے کسی کمی کے شاک نہیں رہیں گے.....!“ وزیر صاحب نے فرمایا۔

”کیوں نہیں جناب! ویسے بھی میرا یہ فرض ہے کہ آپ کے ہر کم کی تعمیل کروں۔“

چوہدری صاحب سرکاری موٹر سائیکل پر جس طرح چپ چاپ آئے تھے اسی طرح چپ چاپ لوٹ گئے۔ دفتر پہنچتے ہی انہوں نے اپنے واحد انسپٹر اکرم کو طلب کر لیا۔

”انتظامی طلباء فیڈریشن کے جتنے بھی ”سورس“ ہیں ان کی فائل لے آؤ۔“ انہوں نے حکم دیا۔

اکرم کی طرف سے مطلوبہ فائل آنے سے پہلے ان کے پاس ”تازہ احکامات“ پہنچ چکے تھے۔ ایک سرسری نظر اے ڈی صاحب کے احکامات پر ڈال کر اس نے حکم موصول کرنے کے دستخط کر دیے۔

”اکرم صاحب.....!“ انہوں نے اپنے انسپٹر کو مخاطب کیا جو ابھی ابھی فائل لے کر آیا تھا۔

”جی سر!“

”یہ لیٹر پڑھ لیجئے۔“ انہوں نے اے ڈی صاحب کے احکامات اسے پڑھنے کے لئے دے دیئے۔

”ٹھیک ہے جناب۔ سمجھ گیا میں!“ انسپٹر اکرم نے مودب لہجے میں کہا۔

”اکرم صاحب! یہ ہمارے لئے چیٹنج کیس ہے۔ سارے ملک کی نظریں اس پر لگی ہیں اور وقت بھی بہت کم ہے۔“ ڈی ایس پی چوہدری نے اسے معاملے کی سنگینی کا احساس دلایا۔

”میں آج ہی کام شروع کرتا ہوں جناب.....“

”مجھے فوری طور پر ملک صاحب کے نزدیکی لڑکوں کی فہرست چاہئے، جیسے بھی ممکن ہو ان میں سے کسی کو توڑ لو۔“ آؤٹ آف دی دے“ بھی جانا پڑے تو پروا نہ کرنا۔ فنڈ کی بھی کوئی فکر نہ کرنا۔ مجھے کل صبح تک ملک صاحب کے لڑکوں کی فہرست چاہئے۔ پھر ہم کسی ایک کو منتخب کر کے کام کریں گے اور ہاں اپنے سب انسپٹر کو اغوا شدہ لڑکوں کے لواحقین کی نگرانی پر مامور کر دو.....

اس روز چوہدری غلام رسول سرکاری عہدہ کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے انسپٹر کی رپورٹ پر دستخط کر رہا تھا جب اچانک فون کی کھنٹی بجی۔ فون کو گالی دے کر انہوں نے بڑی بے دلی سے ہیلو کہا۔

پھر.....!

ان کے ماتحت حیران رہ گئے جب چوہدری صاحب اچانک ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ان لوگوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔

فون پر کوئی ”اہم مرکزی شخصیت“ اس سے مخاطب تھی۔ اس شخصیت نے چوہدری غلام رسول کو سرکٹ ہاؤس میں ملاقات کے لئے طلب کیا تھا۔ چوہدری صاحب نے دل ہی دل میں نجانے کتنی مرتبہ سجدہ شکر گزارا کہ کسی اہم شخصیت کو ان کا خیال تو آیا۔

○

سرکٹ ہاؤس میں چوہدری صاحب کا استقبال مرکزی وزیر کے سیکرٹری نے کیا۔ اس نے چوہدری صاحب کو پہلے ہی باور کروادیا تھا کہ یہ ملاقات بالکل ”آف دی ریکارڈ“ ہے اور اس ضمن میں کسی کو کانوں کا غبر نہیں ہونی چاہئے۔

مرکزی وزیر نے چوہدری صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے کہا کہ مرکزی حکومت کی ”گڈ بکس“ میں ان کا نام موجود ہے۔ اگر وہ اس مہم میں سرخرو ہو گئے تو نہ صرف پولیس سرورس میں واپس چلے جائیں گے بلکہ ان کو خصوصی ترقی بھی ملے گی۔

مرکزی وزیر نے انہیں انتظامی تنظیم کے دونوں جوانوں جاوید اور اختر کے کوائف مہیا کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان دونوں کے متعلق فوری رپورٹ چاہئے کہ ان کے ساتھ کیا گزری؟

”آپ کو سرکاری طور پر آج ہی اس کیس پر کام کرنے کے احکامات مل رہے ہیں۔ زحمت صرف اس لئے دی ہے کہ آپ اپنے آدی ہیں ضروری نہیں کہ ہر اہم اطلاع فائل پر چڑھا دی جائے۔ فائلوں کا پیٹ بھی ضرور بھرئیے لیکن ہمارے مشورے کے بعد..... آپ جو نتائج اخذ کریں جو بھی اہم اطلاع ملے برائے مہربانی پہلے وہ میرے ساتھ ڈسکس کر لیجئے۔ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ ”آن دی ریکارڈ“ کیا آنا چاہئے اور ”آف دی ریکارڈ“ کیا رہنا چاہئے۔

”آپ کے حکم کی پابندی ہوگی سر!“ ڈی ایس پی چوہدری غلام رسول نے آداب

کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ان کے کمرے میں نصب ٹی وی پر ”دن ڈے کرکٹ میچ“ چل رہا تھا اور ”اے ڈی“ ادھر منہ کئے ہمہ تن گوش تھے۔

”جناب والا! اگر بھارتی سفارت خانے میں تقریب میں شرکت کرنے والے مہمانوں کی فہرست مل جاتی تو میں بہت شکرگزار ہوں گا۔“ چوہدری غلام رسول نے کہا۔

”ارے چوہدری صاحب! یہ بھی کوئی بات ہے۔“

اے ڈی صاحب نے انٹرکام پر اپنے متعلقہ انسپکٹر کو چوہدری صاحب سے مکمل تعاون کا حکم دے کر اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ کرکٹ میچ ایسے سنسنی خیز مرحلے میں داخل ہو چکا تھا کہ وہ اب پلک جھپکنے کا خطرہ بھی مول لینے کو تیار نہ تھے۔ چوہدری صاحب کی روانگی کے فوراً بعد ہی انہوں نے چڑاسی کو ہدایت کر دی کہ اگلے حکم تک کسی کو کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔

ڈی ایس پی چوہدری غلام رسول کی باچھیں کھل گئیں جب اس نے بھارتی سفارت خانے کے ممکنہ مہمانوں کی فہرست میں ملک صاحب کا نام دیکھا۔ متعلقہ عملے سے چائے پی کر ان کا شکریہ ادا کر کے وہ باہر آ گیا۔

اپنی میز پر پہنچنے تک اس نے پچھلے تمام ”رابلے“ بھول کر ”نیا جہان“ آباد کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کھیل میں ایجنسی کے اور لوگوں کو بھی کودنے کا موقع دے۔

اگلے روز وہ انسپکٹر اکرم سمیت سفارت خانے کے دروازے پر موجود تھا۔ انہوں نے ملک کو ایک نوجوان کی معیت میں سفارت خانے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

”اسے پہچانتے ہو؟“

انہوں نے انسپکٹر اکرم سے ملک کے ساتھی کے متعلق دریافت کیا۔

”یہ ارسلان ہے جناب! عہدے کے لحاظ سے تو انقلابی طلباء کا جنرل سیکرٹری لیکن

ایک نمبر کا غنڈہ۔ مار دھاڑ کرنے والوں کے گینگ کا سردار یہی تو ہے۔ ملک کا بہت چیتا ہے آج

کل۔ اس سے پہلے غائب ہونے والا لڑکا آخر ملک کا خاص آدمی تھا۔ آج کل یہ ہے۔ اپنی

بیوی سے زیادہ ملک اس پر اعتبار کرتا ہے۔“

”گڈ! چوہدری غلام رسول نے اکرم کی اطلاعات پر اسے داد دینے کے انداز میں کہا۔

لواحقین کے ملاقاتیوں پر کڑی نظر رکھو۔ خاص طور سے اس بات کا خیال رکھنا کہ کون کون سی شخصیات ان سے ملتی ہیں۔ مجھے اس کیس کی پہلی فائل بھی لا دو۔ پہلے کس نے کام کیا تھا اس فائل پر؟“

”سر انسپکٹر شفیع نے۔“

”کہاں ہے وہ آج کل؟“

”ایمرڈ (غیر ملک میں) سر! جانے کیا کارنامہ انجام دے دیا تھا اس نے۔ اس کیس کے فوراً ہی بعد اس کو سعودہ بھیج دیا گیا۔“ انسپکٹر اکرم نے جلتے جلتے لہجے میں کہا۔

چوہدری صاحب کو اب کچھ سمجھ آنے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے مجھے فائل لا دو اور تم لوگ اپنا آپریشن شروع کر دو۔“

○

انسپکٹر اکرم کو آج پھر کچھ کر دکھانے کا موقع ملا تھا۔ اس نے سوچا ”نیا افسر ہے اور پولیس سے آیا ہے۔ ممکن ہے اس کی محنت کا احساس کر کے اس کے متعلق کوئی اچھی رپورٹ اوپر بھیج دے اور اسے بھی باہر نکلنے کا چانس مل جائے۔ اس نے انسپکٹر شفیع والی فائل کا ایک ایک لفظ حفظ کر لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ انقلابی طلباء کا ”گاڈ فادر“ کون ہے۔

اس نے اگلے ہی روز یونیورسٹی کا چکر لگایا اور دوسرے دن چوہدری غلام رسول کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

”اچھا تو یہ ”ملک صاحب“ ہیں۔ ٹھیک ہے تم اغوا ہونے والے لڑکوں کے لواحقین کو ٹٹولو۔ ملک کو میں خود دیکھوں گا۔“ چوہدری غلام رسول نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس نے سانپ کے بل میں سر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انسپکٹر کی اتنی ہمت نہیں کہ اس کے نزدیک ہی چٹک جائے۔ اسے خود میدان میں اترنا ہوگا۔ تب ہی وہ ”سرکار دربار“ میں سرخرو ہوگا۔

کچھ سوچتے ہوئے اس نے ”انڈین ڈیک“ والے اے ڈی سے رابطہ قائم کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ اس کے دفتر میں موجود تھا۔

”کیسے چوہدری صاحب کیسے بھول پڑے ادھر۔۔۔۔۔!“ اے ڈی نے بیٹھتے ہوئے اس

”ارسلان باؤ! ہم خاندانی کچھر ہیں۔ ایسے گرے پڑے بازاری لوگ نہیں کہ کسی محسن کو بھی یاد نہ رکھیں۔ تمہارے احترام میں کبھی کی نہیں آئے گی۔ بس ہمارا کام چلتا رہے تمہارا بھی چلتا رہے گا.....!“ مختاراں بائی نے اپنے مخصوص کاروباری لہجے میں اس کی بات کا ایک جواب دے کر اسے ہزار معنی سمجھادیئے تھے۔

○

یہاں سے وہ سیدھا ملک صاحب کے گھر ہی آیا تھا اور ڈرائنگ روم میں ہی سو گیا۔ صبح وہ دیر گئے تک سوتا رہا۔ کسی نے اسے جگایا نہیں۔ جب وہ بیدار ہوا تو ڈرائنگ روم کے ریشمی پردوں پر دھوپ چمک رہی تھی۔ رات کے سارے واقعات کی فلم ایکایک اس کے دماغ میں چلنے لگی۔ اچانک ہی ڈرائنگ روم سے ملحقہ دروازہ کھلا اور ملک صاحب اندر چلے آئے۔ وہ کہیں جانے کی تیاری میں تھے۔

”کیا حال ہے بیٹا.....؟“ انہوں نے ایسے دریافت کیا جیسے وہ معمول کے مطابق بات کیا کرتے تھے جیسے رات اس گھر پر اتری ہی نہیں تھی..... ”بھئی تم تو بڑے کام کے آدمی ہو۔“ ملک صاحب نے اپنی باتیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ ”وہ آخر تو سالہا جھک ہی مارتا رہا۔ شاباش بیٹا! دل خوش کر دیا تم نے۔ واقعی تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ تم تو جانتے ہو آج کل میں کتنی زیادہ ٹینشن کا شکار ہوں۔ الیکشن سر پر ہے اور ہر روز دو تین میٹنگوں میں آنا جانا، بھئی! میں تو سچی بات ہے اس سیاست سے تنگ آ گیا ہوں۔ یہ تو تم تو جوانوں کی خدمت کا جذبہ ہے جس نے ابھی تک مجھے قائم رکھا ہے..... ہاں! اسے تھوڑی دیر بعد گھر پہنچا آنا اور کل شام تم میرے ساتھ بھارتی سفارت خانے کی دعوت پر جا رہے ہو۔“ انہوں نے ارسلان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ارسلان میاں! تم انقلابی فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری ہو اور اب تمہارا تعارف بین الاقوامی حلقوں میں بھی ہونا چاہئے۔ میں تمہیں سیاست میں اپنا جانشین بنانا چاہتا ہوں۔“ بڑی رازداری کے لہجے میں انہوں نے ارسلان کے نزدیک صوفے پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”شکر یہ ملک صاحب! آپ نے مجھے کسی قابل جانا۔“ ارسلان نے انتہائی منافقت کا مظاہرہ کیا۔

”ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔ تم یہ رکھ لو۔ میں نے ”ان لوگوں“ کو ”فارغ“ کر دیا

”آؤ واپس چلیں ہمارا آج کا کام ختم۔ تم کل تک اغوا ہونے والوں کے لواحقین کی رپورٹ تیار کر لو۔“

چوہدری نے واپس مڑتے ہوئے اسے کہا۔

دونوں الگ الگ سمتوں میں اپنے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

○

آدھی رات کو وہ ڈرائنگ روم میں اوٹھ رہا تھا جب مختاراں نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

”بیٹا مجھے ذرا چھوڑ آؤ۔ بچی کو ملک صاحب صبح خود پہنچا دیں گے۔“

مختاراں نے شراب کے نشے میں ڈمکاتے ہوئے ارسلان سے کہا۔

”اس کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ اس حرافہ کا منہ نوج لے لیکن حالات نے اسے منافقت اور مصالحت کے ایسے ہتھیاروں سے لیس کر دیا تھا کہ اب اس کے اپنے جذبات کی کوئی حیثیت رہ ہی نہیں گئی تھی۔“

”بی بی خوش تو ہوتا؟“ اس نے بے شرمی کی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تو نے تو ہم غریبوں کی قسمت کا بند دروازہ کھول دیا۔“

مختاراں بائی کے انگ انگ سے خوشی کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ اس نے براہ راست ملک کو قابو کر لیا تھا اور وہ جانتی تھی اب اس شہر میں کسی کی جرأت نہیں کہ اس کے سامنے سر اٹھا کر چلے۔ ملک کے ذریعے وہ بازار میں اپنے حامدوں کا ناٹھ بند کر سکتی تھی۔

گاڑی میں ارسلان اسے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔ سارے راستے اس نے اپنے جذبات کو چھپائے رکھا تھا اور ہنس ہنس کر مختاراں سے باتیں کرتا آیا تھا۔ اس نے مختاراں کو اپنے دلی جذبات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

روانگی پر اس نے مختاراں کو خبردار کرتے ہوئے کہہ دیا تھا ”بی بی ایک بات کا خیال رکھنا کہ اس دروازے تک تمہیں میں نے پہنچایا ہے۔ آخر نے تمہیں ملک صاحب کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ کہیں اپنے اس ”راہطے“ کو درمیان سے نہ نکال دینا۔ جس پل سے تم گزر کر ملک صاحب کے گھر تک پہنچی ہو اس پل کے بغیر دریا عبور نہیں کر سکو گی.....!“

ہے۔ پھر بھی اپنے ہاتھ سے کچھ بخشش دے دینا۔ اس طرح یہ لوگ دب کر رہتے ہیں۔“
ملک نے آنکھ دباتے ہوئے نوٹوں کا ایک بنڈل ارسلان کو تھما دیا۔
”کل ادھر گھر پر ہی آ جانا۔ یہیں سے شام کو اکٹھے نکل چلیں گے۔“ اس نے کمرے سے
باہر نکلتے ہوئے اس نے ارسلان سے کہا۔
”شکریہ ملک صاحب۔ بہت شکریہ۔“ اس نے نوٹوں کا بنڈل اپنے کوٹ کی جیب میں
ڈالتے ہوئے کہا۔

اس گھر کی کوئی چیز اس کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی غسل خانے کا رخ کر
رہا تھا۔ جب وہ نہادھو کر باہر نکلا تو ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر مسز ملک اس کی منتظر تھی۔
بے ساختہ اس کا ہاتھ ماتھے تک اٹھ گیا۔

”شاباش! تم میں ایک اچھا استاد بننے کی اہلیت موجود ہے۔ کم از کم تم ایک
کامیاب انسان ضرور بن سکتے ہو۔ ارسلان! جس شخص کو اپنے دلی جذبات چھپانے اور منافقت
سے بات کرنے کا ڈھنگ آ جائے کامیابی اور کامرانی کے دروازے ایک ایک کر کے اس پر کھلتے
چلے جاتے ہیں۔ شاباش! اس طرح گدھے کو بیوقوف بناتے رہو۔ ایک دن ایسا آ جائے گا جب یہ
تمہارے لئے وہ کچھ کرے گا جو کچھ اب تم اس کے لئے کر رہے ہو۔۔۔۔۔۔ ہاں ناشتہ میرے ساتھ
کرنا۔ ذرا اس کیتا کی خبر لے آؤ۔۔۔۔۔۔!“

مسز ملک کی مسکراہٹ بہت گہری اور جان لیوا ہو رہی تھی۔

سر دیوں کی اس روشن صبح کی ساری تازگی اس کے بدن کی سنو لاہٹ میں سمٹ آئی
تھی۔ اس کا سانولا چہرہ نکھر کر گہرے سرخ رنگ کے دیسی گلاب کی صورت اختیار کر گیا تھا۔
مسکرانے سے اس کی آنکھیں سارے چہرے پر پھیل جاتی تھیں۔ ان آنکھوں میں اسرار کی تھیں
اتنی گہری تھیں کہ ارسلان کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔

”شکریہ مسز ملک!“ اس نے نازنین والے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”ایک منٹ ٹھہرو۔“ مسز ملک نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

”میری نصیحت یاد رکھنا۔ اپنے دلی جذبات کا اظہار کبھی نہ کرنا۔ اس عورت کو یہ احساس
نہ ہونے دینا کہ تمہیں اس کے رویے سے تکلیف پہنچی ہے۔ کبھی نہیں۔۔۔۔۔۔ اور ہاں تم مجھے نجمہ کہہ

سکتے ہو۔“ وہ سگریٹ کا کش لگاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔
”شکریہ!“ بے اختیار ارسلان کے منہ سے نکلا۔

○

جب وہ نازنین والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو نازنین آرام دہ بستر
سے ٹپک لگائے ٹی وی پر فلم دیکھ رہی تھی۔ ارسلان کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے ریموٹ سے
ٹی وی آف کیا اور ایسی بے قراری سے اٹھ کر اس سے لپٹی کہ ارسلان بھونچکا رہ گیا۔
اس سے لپٹی دو تین منٹ تک ٹسوے بہاتی اور اپنی قسمت کو کوستی رہی۔ اس نے
ارسلان سے کہا کہ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ملک صاحب اس قماش کے آدمی
ہیں ورنہ وہ کبھی اپنی ماں کے ساتھ یہاں نہ آتی۔
”ارسلان باؤ! اگر میں ذرا سی بھی مزاحمت کرتی تو یہ شخص ہمیں تباہ کر کے رکھ دیتا۔ تم تو
جانتے ہی ہو اس کے کتنے لمبے ہاتھ ہیں۔“

”نازنین! بیوقوف نہ بنو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ مجھے تم سے کوئی گلہ
نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے کبھی بیوفائی نہیں کرو گی۔ تم بھی میری طرح مجبور ہو۔ میں تو
تمہیں یہ بتانے والا تھا کہ یہ ہمارے لئے بہت اچھا ہوا۔۔۔۔۔۔ تمہارے ہاتھ سونے کی چڑیا لگ گئی
ہے۔ اگر ہم دونوں مل کر چلیں تو کروڑوں کی آسامی ہمارے ہاتھ آ جائے گی۔ بس ذرا ہوشیاری کی
ضرورت ہے۔ تم نے دیکھ لیا ملک صاحب میری ہر بات مانتے ہیں۔“

اس کا جواب نازنین کے لئے بالکل خلاف توقع تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ ٹھٹھک کر
ہی رہ گئی۔ شاید وہ فیصلہ کر رہی تھی کہ جو کچھ اس کے کانوں نے سنا ہے اس پر یقین کرے یا نہ
کرے؟ پھر اس نے سوچا کہ ملک صاحب لاکھ ہوشیار چالاک اور بارہ سوخ سہی ارسلان بھی کچھ کم
نہیں اور یقین ممکن ہے کہ وہ اس کی مدد سے ملک پر ہاتھ صاف کرنے کا پروگرام بنا رہا ہو۔ گویا اب
وہ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بھی بن گئے تھے۔ ارسلان نے اس کی حریصانہ فطرت کو بڑے
احسن طریقے سے ایکسپلاٹ کیا تھا۔

”ارسلان! تم میری توقع سے بڑھ کر عظیم نکلے ہو۔“ اس نے ارسلان کے ساتھ ہی

پلنگ پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

انٹیلی جنس

اسی روز شام کو دونوں سفارت خانے کی تقریب میں جا رہے تھے۔ مسز ملک نے ایک کچلر سوسائٹی کے پروگرام میں شرکت کرنی تھی۔ اس نے پہلے ہی ملک صاحب کے سامنے اپنی مجبوری بیان کر دی تھی۔ یوں بھی اب اختر کا کوئی پیسہ نہیں چل رہا تھا اور ملک صاحب نے ارسلان کو ہی اپنی بیساکھیاں بنانا تھا۔

ملک صاحب کی گاڑی سفارت خانے کے لاؤنج میں پارک ہوئی تو ایک باوردی ملازم نے آگے بڑھ کر اس کا دروازہ کھولا اور ان کی رہنمائی اس ہال کرنے کی طرف کی جہاں استقبالیہ ترتیب دیا گیا تھا۔ ڈرائیور تو وہیں رک گیا، دونوں ہال کرنے کی طرف چل دیے۔

ملک صاحب کی شکل پر نظر پڑتے ہی ایک خوبصورت لڑکی نے مسکراتے ہوئے ہال کا دروازہ کھول دیا۔ یہ لڑکیاں بھارت کے مخصوص لباسوں میں ملبوس مہمانوں کا استقبال کر رہی تھیں۔ ہال کمرے کا دروازہ کھلتے ہی خوشبو اور رنگ و نور کا ایک سیلاب اس کی آنکھوں نے امنڈتے ہوئے دیکھا۔ یہاں سینکڑوں مرد اور عورتیں جمع تھیں۔ ان میں ملکی وغیرہ ملکی دونوں قسم کے لوگ موجود تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے جہاں وہ آئے ہیں وہ کوئی اور ہی دنیا ہے۔ عورتیں اور مرد ایک دوسرے سے چپکے مختلف کونوں میں کرسیاں سنبھالے بیٹھے تھے۔ متعدد بیرے اپنے ہاتھوں میں

”ابھی نہیں۔ اس کام کے لئے ساری زندگی پڑی ہے ہمیں ہر قدم احتیاط سے اٹھانا ہے۔ تم فلم دیکھو میں اندر دوسری فلم دیکھ کر ابھی آیا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو نہیں بجا کر بیرے سے طلب کر لیتا۔“ اس نے آہستگی سے خود کو نازنین سے الگ کرتے ہوئے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

”اوکے!“ نازنین نے بے ہودہ سی حرکت کرتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دے دی اور ایک مرتبہ پھر اس نے وی سی آر اور ٹی وی کے سوچے آن کر لئے تھے۔

○

تھوڑی دیر بعد وہ مسز نجمہ کے ساتھ ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ مسز ملک نے اسے اپنے ہاتھوں سے ٹوسٹ پر کھین لگا کر دیا تھا۔

”کل تم ملک کے ساتھ بھارتی سفارت خانے میں جاؤ گے۔ اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنا لیکن زبان بند۔ یاد رکھنا اس تقریب کے پاکستانی مہمانوں میں انٹیلی جنس کے لوگ بھی شامل ہوں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ ابتدا ہی میں اس حوالے سے تمہاری کوئی فائل کھل جائے۔“ مسز ملک نے واقعی اسے بہت قیمتی نصیحت کی تھی.....!

”نازنین کو چھوڑ آؤ لیکن آج ہی اس سے بزنس کی بات نہ کر لیتا۔ ابھی کچھ دن گزربے۔ دو۔ پھل کچا بھی اتنا ہی نقصان دہ ہے جتنا زیادہ پکا ہوا۔ اگر تم اعتدال کے ساتھ چلتے رہے تو اپنا مقصد پا لو گے.....!“ وہ ارسلان کو بچوں کی طرح زندگی کے انسر اور رموز سے آگاہ کر رہی تھی۔

”مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب بھی تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو بلا تکلف میرے پاس چلے آنا۔“ اس نے دم رخصت ارسلان سے کہا تھا۔

نازنین کو ارسلان خود چھوڑنے آیا اور گاڑی میں سارے راستے اسے یہی باور کرواتا رہا تھا کہ دونوں اگر چاہیں تو مل کر بہت مال کما سکتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے دوسرے کے ساتھ دھوکہ کر کے السیدھا کرنے کی کوشش کی تو دونوں مارے جائیں گے۔

نازنین واقعی خاندانی کجری تھی۔ وہ اب ارسلان کا مطلب سمجھنے لگی تھی۔ یوں بھی وہ جانتی تھی کہ مضبوط ”چارے“ کے بغیر وہ شکار کیسے کھیلے گی؟

خواہش تھی کہ ہمارے نوجوانوں کا ایک دوسرے سے رابطہ ہو۔ یہ تو ہمارا سو بھاگیہ ہے جو ارسلان صاحب تشریف لائے۔ مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ارسلان صاحب۔ آپ ایسے لبرل اور روشن دماغ لوگ اس برصغیر کی واحد امید ہیں۔ میں نے آپ کی سرکار کو متعدد مرتبہ ”پروزل“ دی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کے زیادہ سے زیادہ ”ڈیلی کیٹن“ ایک دوسرے کے ملک کا دورہ کریں۔ اس طرح انہیں قریب آنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع تو ملے گا۔ کچھ عجب نہیں ملک صاحب کہ جو کام ہم لوگ نہیں کر سکتے وہ یہ نوجوان کر گزریں۔ نوجوان ہماری طرح تنگ نظر نہیں ہوتے ملک صاحب! یہ نفرت اور تعصب جو ہماری نسل نے انہیں ورثے میں دیا ہے اس کو دھکی آندھی کے سامنے ان کے عزائم ہی دیوار کھڑی کر کے ایک دوسرے کو قریب لاسکتے ہیں۔“ ترپانھی نے ایک ہی سانس میں نجانے کتنی باتیں کہہ دی تھیں۔

اسے ارسلان کی اچانک آمد سے بہت خوشی ہوئی تھی۔ بڑی بے تکلفی سے وہ ارسلان کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف لے گیا۔ اس اثنا میں ملک صاحب ایک غیر ملکی خاتون کا طواف کرنے لگے تھے۔

ترپانھی اسے لے کر ایک کونے میں موجود ایک بھارتی سندری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”یہ میری بیٹی کا نانا ہے اور کانتا بیٹی یہ ہیں انقلابی سٹوڈنٹس کے جنرل سیکرٹری مسٹر ارسلان!“ اس نے دونوں کا تعارف کروایا۔

”ہیلو.....!“ کہہ کر کانتا نے اپنے ماتھے پر آئے بال جھٹکے سے پیچھے کی طرف گراتے ہوئے ارسلان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اسے اپنے خون کی گردش بڑھتی محسوس ہونے لگی۔

”ہیلو.....!“ کہہ کر اس نے کانتا کا ہاتھ تھاما اور ایک برقی لہر اس کے سارے بدن میں سرایت کر گئی۔

”آپ لوگ باتیں کریں میں ذرا دوسرے مہمانوں کو دیکھوں۔ ایکس کیوز می مسٹر ارسلان۔“ ترپانھی نے ”شکار“ اپنی بیٹی کو سوچتے ہوئے اس کی اہمیت سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

”کیسے ہیں آپ؟ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ بھی میں تو بہت سوشل ہوں۔ یہاں ہر جگہ آتی جاتی ہوں۔ مجھے تو پاکستانی نوجوانوں سے مل کر بہت آند ہوتا ہے۔ اتنے ”براڈ مائنڈ“ ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ آپ تو خاصے مشہور آدمی ہیں۔ آیا کیجئے تاکہ کبھی ہماری

مشروبات کی فطرتیاں تھامے بھاگے پھر رہے تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص رہا ہو جس کے ہاتھ میں جام نہ ہو۔ خصوصاً ملکی مہمان مفت کی شراب پر یوں ٹوٹ کر گرتے تھے جیسے انہیں دوبارہ زندگی میں یہ کچھ دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوگا۔

ہال کے ایک کونے میں بنی سٹیج پر کچھ سازندے بھارتی گیتوں کی دھنیں بجا رہے تھے اور بھارتی سندریاں جوڑوں اور ہاتھوں میں گجرے سجائے آنے والوں کی آرتی اتار رہی تھیں۔ انہوں نے بہت سے مہمانوں کے ماتھے پر تلک بھی سجا دیے تھے۔ روپہلی ساڑیوں سے پھیلنے ان کے پچیلے جسموں سے اٹھنے والی خوشبو کی لپٹیں ہونٹوں اور آنکھوں میں ناچتی مسکراہٹ نے مہمانوں کے ایمان ڈگمگا دیے تھے۔ ہر کوئی ایسی کسی بھی سندری کی چند منٹ کی ”کپنی“ کے لئے باؤلا ہوا جاتا تھا۔

سفارت خانے کا مردانہ عملہ ہر آنے والے مہمان کا ”سواگت“ جی جان سے کر رہا تھا۔ ملک کی نامور طوائفیں جب اب مغنیہ اور فلشمار کہلاتی تھیں یہاں بطور خاص مدعو کی گئی تھیں۔ چوٹی کے سرمایہ دار تاجر سیاستدان و کلاء اور ڈپلومیٹس اس مجلس میں موجود تھے۔ ملکی مہمانوں خصوصاً سفارت خانے کی خواتین کے گرد پیشگو کی طرح جھنجھنا رہے تھے۔ ہر کسی کی خواہش تھی کہ وہ دوسرے سے بڑھ چڑھ کر غیر ملکیتوں کی توجہ کا مرکز بنے۔

ملک صاحب اور ارسلان نے شراب کے بجائے سافٹ ڈرنکس لئے تھے۔ ملک کی یہ مجبوری تھی کہ وہ اس مجلس میں شراب کے باہم کو چھو کر اخبار نویسوں کے لئے کوئی کہانی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ الیکشن نزدیک آرہے تھے اور اسے خود پر جبر کر کے مکمل منافقت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ بصورت دیگر ان حالات میں کوئی معمولی سی خبر بھی اس کا سارا سیاسی کیریئر تباہ کر سکتی تھی۔

بھارتی سفیر ملک کی شکل پر نظر پڑتے ہی بھاگتا ہوا اس طرف آیا تھا۔ ”ہیلو ملک صاحب کیسے ہیں آپ؟“ اس نے ملک سے بے تکلفی سے معافہ کیا۔ دونوں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف نظر آرہے تھے۔

”ترپانھی صاحب یہ ہیں مسٹر ارسلان!“ ملک نے خیر خیریت سے نمٹنے کے بعد ارسلان کا اس سے تعارف کرایا۔ ”انقلابی طلباء فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری.....!“

”اوہو بھی واہ! مرا آگیا۔ واہ ملک صاحب کمال کے آدمی ہیں آپ۔ میری تو دلی

”کیسا رہا پروگرام؟“

”سرجی! مزہ آ گیا۔ بڑے ایڈوانس لوگ ہیں۔“ ارسلان نے ندیدے بچوں کی طرح ہوسناک لہجے میں کہا۔

”بیٹا! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے..... ان لوگوں سے دوستی بڑی فائدہ مند ہوتی ہے۔ کسی عزیز دوست کو دیزے کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور بندہ کبھی کبھی خود بھی موج میلہ کر لیتا ہے۔“ ملک نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بائیں آنکھ دبا لی۔ اس وقت وہ تیسرے درجے کا لفٹنگ دکھائی دے رہا تھا۔

ڈنر کے دوران بھی کانٹا اس کے گرد منڈلاتی رہی۔ اس نے کئی چیزیں اپنے ہاتھ سے ارسلان کی پلیٹ میں رکھی تھیں اور رخصت ہونے پر ایک مرتبہ پھر اس سے دوبارہ ملنے کا وعدہ بھی لیا تھا۔

ترپاشی انہیں رخصت کرنے کے لئے دروازے تک آیا تھا۔

○

چوہدری غلام رسول کو انسپکٹر اکرم نے بتا دیا تھا کہ لوہتین خوفزدہ ہیں۔ انہیں دھمکی تو کسی نے نہیں دی لیکن انہیں اس بات کا احساس ہے کہ اگر انہوں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا تو نجانے ان پر کیا قیامت گزر جائے۔ دونوں گھرانوں کو ملک صاحب کی طرف سے کچھ مالی انداد کا وعدہ بھی کیا گیا تھا۔ ملک صاحب نے دونوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر نہ تو وہ کوئی بیان دیں گے نہ ہی کسی سے ملنے کی کوشش کریں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ملک صاحب اس کیس سے الگ ہو جائیں گے پھر ساری زندگی ان کے بیٹے انہیں واپس نہیں مل سکیں گے۔

ارسلان اور اس کے گینگ کے دوسرے لوگوں سے متعلق بھی اس نے ساری رپورٹ ڈی ایس پی صاحب کے سامنے رکھ دی تھی۔

”ویل ڈن..... شاباش! اپنا کام جاری رکھو۔ میں تمہاری محنت ضائع نہیں جانے دوں گا۔“ چوہدری نے تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اب اسے عملی میدان میں خود اترنا تھا۔ اچانک ہی انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ اسے انڈین ڈیسک والے بے ڈی نے اپنے کمرے میں چائے پینے کے لئے بلایا تھا۔ یہ معمول کی بات تھی

ہاں۔ آپ سے باتیں کر کے بہت خوشی ہوگی۔“ کانٹا اردو ایسی شاندار بول رہی تھی کہ اس پر ”بھارتیہ ناری“ ہونے کا گمان ہی نہیں گزرتا تھا۔

○

ارسلان کو اپنے ساتھ لئے وہ ایک کونے میں صوفے پر بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے ارسلان سے باتوں باتوں میں ان کی تنظیم کے متعلق بہت سی ایسی باتوں کا پتہ بھی چلا لیا تھا جو کبھی ارسلان کے ذہن ہی میں نہیں رہی تھی۔ کانٹا اس طرح اس کے ساتھ چپک کر بیٹھی تھی کہ ارسلان کو خود ”رلج انڈر“ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس طرح بڑے نامحسوس انداز میں ارسلان کی ایسی ایسی خوبیاں تلاش کی تھیں کہ اسے اپنی شخصیت وی آئی پی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ نہ رکنے والے ریکارڈ کی طرح کانٹا کے سامنے بچنے لگا تھا..... کانٹا کے اصرار پر اس نے کانٹا کے ساتھ ”بیزر“ شیز کی تھی اور آئندہ بھی اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ کانٹا نے اسے بتایا تھا کہ اس نے مقامی لینگوئج انسٹیٹیوٹ میں فرنیچ زبان میں داخلہ لے رکھا ہے جہاں وہ دونوں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ اس نے ارسلان کو کہا تھا کہ کبھی اسے بھارت کی سیر کرنے کی خواہش ہو تو بلا تکلف اسے بتائے بلکہ اس نے سردیوں کی چھٹیاں بھارت میں گزارنے کی اسے باقاعدہ دعوت دے ڈالی تھی۔

ڈنر کے آغاز تک وہ اس سے چپکلی رہی۔ دونوں نے پاکستان اور بھارت کی سٹوڈنٹس پالیسیکس پر جی بھر کے باتیں کی تھیں۔ اسی دوران کانٹا نے بہانے بہانے سے اسے اپنے جسم کے سارے اسرار و رموز سے آگاہ کر دیا تھا۔

ارسلان یہ بات نوٹ نہ کر سکا کہ سیاہ شیشوں کی عینک والے ایک درمیانی عمر کے پاکستانی نے اس پر مسلسل نظریں جم رکھی تھیں۔ جب وہ ترپاشی سے باتیں کر رہا تھا تو یہ شخص ان کی طرف پیٹھ کئے بظاہر میوزک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ان کی باتیں سن رہا تھا اور کانٹا کے قرب نے اس پر ایسی مدہوشی طاری کی تھی کہ وہ اس شخص کے بار بار اپنے نزدیک کسی بہانے ٹھہر کر باتیں سننے کی کوشش کو بالکل نظر انداز کر گیا۔

ملک صاحب اس دوران سپر طاقتوں کے سفیروں اور ان کی بیگمات اور سیکرٹریوں سے مصافحہ اور گفتگو فرماتے رہے۔ ڈنر پر انہوں نے ارسلان سے چھپتے ہی دریافت کیا تھا:

دانست میں یہ اس کے دوست تھے جو صبح ہی اسے لینے آ گئے تھے۔ بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا اور دو اجنبی چہروں پر نظر پڑتے ہی حیران رہ گیا۔

”کون ہوتم؟“ اس نے آنے والوں سے اپنے معمول کے لہجے میں دریافت کیا۔
 ”اگلی کوئی بات کہنے سے پہلے اس بات کا خیال رکھنا کہ ہمارے پندرہ ساتھیوں نے اس فلیٹ کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔“ نوواردوں میں سے ایک نے اسے انگلی کے اشارے سے فلیٹ کے سامنے والی گراؤنڈ کے کونے میں کھڑی جیپ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جیپ سے ایک شخص نے ہاتھ ہلا کر انہیں احساس دلایا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہیں۔
 ”لیکن آپ ہیں کون.....؟“ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ارسلان نے اپنا لہجہ تبدیل کر لیا تھا۔

”ہمارا تعلق سیکورٹی سے ہے اور ہم تمہارے ساتھ دوستی کرنے آئے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔ آؤ اندر بیٹھتے ہیں اطمینان سے بات کر لیں گے۔“
 اس مرتبہ دوسرے نے جواب دیا اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔
 ”کس اجنبی سے تعلق ہے آپ کا؟“ ارسلان نے دریافت کیا۔
 ”آئی ایس آئی سے!“ انہوں نے اپنی تربیت کے مطابق جھوٹ بول کر غلطی اجنبی بتا دی۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم کسی اور جگہ بیٹھ کر بات کر لیں۔ یہاں آپ کے دوستوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا.....!“ نوواردوں میں سے ایک نے جو چوہدری غلام رسول تھا، بڑے مؤدب لہجے میں اسے کہا۔
 ”ٹھیک ہے۔“ ارسلان نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

دونوں کی معیت میں وہ نزدیک ہی ایک چھوٹے سے ریسٹوران میں چلا گیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ جیپ بھی ان کے ساتھ ہی ریگتی ہوئی ہوٹل کے سامنے سڑک کے کنارے آ کر ٹھہر گئی تھی۔

دونوں نے اس سے بھارتی سفارت خانے کی دعوت اور اختر اور جاوید کے قتل سے متعلق سوالات شروع کر دیئے تھے۔ ارسلان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس بات کا

لیکن آج نجانے کیوں چوہدری صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ عموماً اپنے کام سے کام رکھتے تھے کیونکہ اجنبی کے لوگوں سے بھی ان کے زیادہ روابط قائم نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے ذہنی طور پر خود کو ابھی تک پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ہی آدمی سمجھا ہوا تھا۔

”آپ کا انسپٹر انقلابی طلباء کے جنرل میگزینی ارسلان کو آج کل چپک کر رہے ہیں؟“ جی ڈی صاحب نے جلد ہی مطلب کی گفتگو پر آتے ہوئے کہا۔
 ”جناب! میں آج کل نو جوانوں کے اغوا والے کیس پر کام کر رہا ہوں اور یہ ہمارے بڑے کام کا لڑکا ہے.....!“ چوہدری نے چونکے بغیر کہا۔

”ہمارے بھی بہت کام کا لڑکا ہے۔ دونوں مل کر کام چلا لیتے ہیں کیونکہ آپ ہماری ٹیم میں ابھی ابھی شامل ہوئے ہیں اس لئے آپ کا احترام تو ہمارے لئے لازم ہے۔“
 جے ڈی صاحب خاصے روشن دماغ تھے۔

”شکریہ جناب جیسے آپ کا حکم.....!“
 ”آپ میرے“ اے ڈی“ سے مل کر آپریشن ڈسکس کر لیں۔“
 تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ آپس میں میٹنگ کر کے اگلا لائحہ عمل ترتیب دے رہے تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر ارسلان کو استعمال کیا تھا۔ چوہدری نے کسی کو اندر کے حالات کی بھنگ بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ وہ اسے معمول کی کارروائی کے مطابق ڈیل کر رہا تھا اور اجنبی کے باقی لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ چوہدری غلام رسول کو چونکہ یہ پہلا اہم کیس ہلا ہے اس لئے وہ کچھ کر دکھانا چاہتا ہے۔ چونکہ ”نواں پردہنا“ ہے جلد ہی اس کا سارا شوق اتر جائے گا۔ پھر وہ ان کی طرح خلیفہ بن کر آفس تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔
 اگلے روز انہوں نے مل کر کارروائی کا آغاز کرنا تھا۔

○

ارسلان حسب معمول صبح دیر گئے سوکر اٹھا تھا۔ اس نے معمول کے مطابق ناشتہ کیا اور پھر ملک صاحب کی طرف جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ ابھی اس نے کپڑے تبدیل ہی کئے تھے جب دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی۔

”آگے سالے صبح صبح۔“ نجانے کبھیوں کو رات کو نیند بھی آتی ہے یا نہیں۔“ اس کی

احساس انہوں نے ارسلان کو دلا دیا تھا کہ ان کے معاملے میں ملک صاحب اس کے کام نہیں آسکیں گے۔

”ہمارا کچھ آن دی ریکارڈ تو ہوتا نہیں نہ ہی ہم پولیس والے ہیں۔ تمہیں اس طرح غائب کیا جائے گا کہ خود تمہارے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوگا کہ تم کہاں ہو۔ تم جانتے ہو بھارتی سفارت کاروں سے تعلقات قائم کرنے عام سویلین کے لئے کتنا بوجہ جرم ہے.....!“ انسپکٹر خورشید نے اس کے پاؤں اکھاڑے۔

”لیکن میں نے کس سے تعلقات قائم کئے ہیں؟“ ارسلان گھبرا گیا۔

”اچھا جی! ارسلان صاحب وہ کتنا دیوی کیا آپ کی.....“ فقرہ ادھورا چھوڑ کر وہ

مسکرایا۔

ارسلان نے بھی زبردستی مسکرا کر خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”دیکھو برادر عزیز! ہم تمہارے بھائی ہیں اور تم بھی ہماری طرح پاکستانی مسلمان ہو۔

اگر ہماری تھوڑی سی مدد کرو گے تو ہم بھی بہت کام آنے والے بندے ہیں..... ملک صاحب سے زیادہ تمہارے کام آسکتے ہیں۔“ چوہدری غلام رسول نے اسے بلا خردوستی کی پیشکش کر دی۔

”وہ مارا.....!“ ارسلان نے دل ہی دل میں سوچا..... ”یہ پیکورٹی والے اگر ان کے

دوست بن جائیں تو بہت سے معاملات میں وہ ملک کا محتاج نہیں رہے گا۔ وہ جانتا تھا کہ انٹیلی جنس والے اپنے تجربوں کی بڑی موجد کرواتے ہیں اور پولیس تو ان کی طرف دیکھتے ہوئے گھبراتا ہے۔

پھر وہ ان لوگوں کے ذریعے اختر اور جاوید کے معاملے میں ”ڈس انفارمیشن“ کو غلط رخ پر ڈال دے..... لیکن غلط کیوں؟ وہ کیوں نہ ملک صاحب کی طرف ہی توپوں کا رخ پھیر دے۔ اس طرح

نجمہ ملک پر بھی ہاتھ صاف کر سکے گا اور..... اور..... بہت کچھ..... ہاں! ظاہر ہے یہ لوگ اسے بھارت سفارت خانے میں جانے سے تو نہیں روکیں گے کیونکہ اس کے جانے سے ہی ان کا کام

چلے گا۔ اس طرح کتنا بھی.....“ وہ دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔

”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ اگر آپ نے کبھی بلیک میل

کرنا شروع کر دیا تو میں بہت کچھ کر گزروں گا.....!“ اس نے ڈرتے ڈرتے انہیں دھمکی دے دی۔

”ارسلان صاحب! اس کی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔ ہم دوستوں کے دوست ہیں۔“

دونوں نے باری باری اس سے گرجوٹی سے مصافحہ کیا۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ ارسلان نے دریافت کیا۔

”کچھ نہیں۔ اپنے معمول کی زندگی گزاریں۔ کتنا دیوی سے رابطہ رکھیں..... ملک

صاحب سے تعلقات بنائے رکھیں۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔“

”اور بس..... ہماری تمہاری دوستی پکی۔“ چوہدری نے جواب دیا۔

”آپ سے رابطہ کیسے ہوگا؟“ ارسلان نے کریدا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ جب ہم مناسب سمجھیں گے مل لیا کریں گے۔“ جواب ملا۔

○

چائے اور سنیکیس ان لوگوں نے خود منگوائے تھے اور اس کا بل بھی اپنی جیب سے ادا کیا

تھا۔ ارسلان نے پہلی ملاقات میں ان کے متعلق کوئی برائتاثر قائم نہیں کیا تھا۔

ان میں سے ایک تو رخصت ہو گیا تھا جب کہ چوہدری اس کے پاس موجود رہا۔ اب وہ

دونوں زندگی گراؤنڈ کی طرف جا رہے تھے۔ ایک کونے میں موجود بیچ پردہ بیٹھ گئے۔ ادھر ادھر کی

باتیں کرنے کے بعد اچانک ہی چوہدری نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”تمہیں اختر اور جاوید والے واقعے کا علم تو ہو گا ہی.....!“

چوہدری نے تیر ہوا میں چلایا تھا لیکن لگا عین نشانے پر۔ ارسلان کے چہرے کا رنگ فق

ہو گیا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا.....؟“ اس نے خود کو سنبھالا۔

”ارسلان صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کیوں گھبرا رہے ہیں؟ میرا مطلب تھا

آخر آپ تنظیم کے جنرل سیکرٹری ہیں اور ملک کے خاص آدمی اس لئے ممکن ہے..... آپ کو اندر کی

بات کا علم ہو..... ویسے تو ہم بھی بہت سی اندر کی باتیں جانتے ہیں لیکن وقت سے پہلے کچھ کہنا ٹھیک

معلوم نہیں ہوتا۔“

”چوہدری نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے اپنی ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

”اچھا ایک بات تو ضرور مانیں گے کہ دونوں کے اغوا کا مقدمہ جھوٹا درج کر دیا گیا

کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔

لیکن..... کہیں اس کے اپنے گلے میں تو پھندا نہیں لگایا جا رہا؟

مشکل تو یہ تھی کہ وہ کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہت سوچ سوچ کر بالا خر اس نے نجمہ بیگم سے مشاورت کا فیصلہ کر لیا۔ وہی ایک ایسی ہستی تھی جس سے کچھ راہنمائی مل سکتی تھی۔ یہ سوچ کر وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔

ابھی وہ اٹھ کر کھڑا ہی ہوا تھا جب اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف مسز ملک اس سے مخاطب تھیں۔

اس کا جی چاہا کہ فوراً مسز ملک کو تازہ حادثے کی خبر دے لیکن اچانک ہی اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔

”اگر ان لوگوں کا تعلق انٹیلی جنس سے ہے تو عین ممکن ہے وہ اس کا فون بھی بگ کر رہے ہوں اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس نے فون پر معمول کے مطابق مسز ملک کی خیریت دریافت کی جس نے ایک ضروری کام سے اسے گھر پہنچنے کو کہا تھا۔

فون بند کر کے وہ ملک دلا کی طرف روانہ ہو گیا جہاں مسز ملک اس کی منتظر تھی۔

”کہو کل کی تقریب کیسی رہی؟“ اس نے چھتے ہی دریافت کیا۔

جواب میں ارسلان نے بلا کم و کاست اسے ساری کہانی سنادی۔ کانتا سے ملاقات کا ذکر اس نے سرسری انداز سے کیا تھا۔

”ہوں.....!“ مسز ملک نے اس کی کہانی کے خاتمے پر لمبی سانس لی۔

”گویا کھیل شروع ہو چکا ہے..... خیر تم فکر نہ کرو۔ بس ذرا ہوشیاری سے حالات کو سنبھالنا..... ملک بچ کر نہیں جاسکتا۔“ ارسلان نے بے چینی سے کہا۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا.....؟“ ارسلان نے بے چینی سے کہا۔

”تم بالکل نہ گھبرانا۔ یہ وفاقی انٹیلی جنس کے لوگ ہیں اور ملک کے خلاف مواد اکٹھا کر

کے اپنے آقاؤں تک پہنچائیں گے تاکہ جب مذاکرات کی میز پر بیٹھیں تو ملک پر ان کی گرفت مضبوط ہو۔ الیکشن نزدیک آرہے ہیں اور اس صوبے سے زیادہ مضبوط اپوزیشن حکومت کو ملے گی۔

ان کی کوشش ہوگی کہ کسی بھی طرح ملک صاحب اور اس کی قماش کے دو تین لوگوں کو صوبائی لیگ

ہے.....!“ چوہدری اس کے چہرے سے ایک لمحے کے لئے بھی نظریں الگ کرنے کو تیار نہیں تھا۔

”ہاں آپ کا اندازہ صحیح ہے۔“ اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔

”شاباش! یہ ہوئی ناں بات۔ اس کا مطلب ہے ہم مستقبل میں اچھے دوست بن سکتے ہیں۔“

چوہدری بڑا گھاگ شکاری تھا۔

”ضرور ضرور۔“ ارسلان کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔

”تمہارے خیال سے اس سارے کھیل کے پیچھے کس کا ذہن کار فرما ہے؟“

”ملک صاحب کا..... جناب والا! وہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ

سکتا.....!“ ارسلان نے جھٹ سے کہہ دیا۔

”کہاں چھپا رکھا ہے اس نے دونوں کو.....؟“ چوہدری نے بے چینی سے دریافت

کیا۔

”بھدا اس کا مجھے علم نہیں نہ ہی مجھے یہ پتہ ہے کہ ان کے ساتھ کیا گزری۔“ ارسلان

نے کچھ ایسے معصومانہ لہجے میں کہا کہ چوہدری بھی دھوکا کھا گیا۔

”تم کسی طرح یہ پتہ لگا دو کہ ملک نے لڑکوں کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ پھر دیکھ لینا کہ ہم

تمہارے ملک کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں یا نہیں۔“

”جی میں کوشش کروں گا.....!“ ارسلان چاہتا تھا اب یہ مصیبت اٹھ کر چلی ہی

جائے۔

”ہمارے لائق کوئی کام ہو تو ضرور یاد کرنا.....!“ چوہدری نے کہا۔

حالانکہ وہ بھی جانتا تھا کہ ارسلان اگر انہیں یاد بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ پہلی

ملاقات میں انہوں نے اسے کوئی رابطہ نمبر ہی نہیں دیا تھا۔

○

ان لوگوں سے رخصت ہو کر وہ سیدھا اپنے فلیٹ پر آیا اور بستر پر گر کر لمبے لمبے سانس

لینے لگا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس ملاقات کا ذکر ملک سے کرے یا نہ کرے۔ اگر یہ لوگ اختر

اور جاوید کے کیس پر کام کر رہے تھے تو ان کی تعینات کو غلط راستے پر ڈالنے کے لئے ارسلان کا ان

سے تو ذکر اپنے ساتھ ملا لیں تاکہ حالات کا پانسہ ان کے حق میں پلٹ جائے۔ تم انہیں بڑے حساب کتاب سے اس بات کے دو تین شواہد فراہم کر دو کہ دونوں نوجوانوں کے غائب ہونے میں ملک کا ہاتھ نظر آئے تو وہ تمہاری جان چھوڑ دیں گے..... جہاں تک بھارتی سفارت خانے والی بات ہے ابھی ایک آدھ ملاقات ان کے کہنے پر کانتا سے کر لو۔ اس کے بعد انہیں کہہ دینا کہ کانتا نے تمہیں لفٹ کروانے سے انکار کر دیا ہے..... اللہ خیر صلا۔“

ارسلان دل ہی دل میں اس کی ذہانت پر عیش عیش کر اٹھا۔ جس مسئلے نے اسے اتنا پریشان کر رکھا تھا اس کا سارا بوجھ مسز ملک نے چند منٹ میں اتار دیا تھا۔

”شکریہ مسز ملک! آپ میری توقعات سے بڑھ کر ذہین اور عظیم ہیں۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”ارے نہیں۔ جب ہم دونوں بزنس پارٹنر ہیں تو پھر ایک دوسرے کے کام تو آتا ہی پڑے گا۔ کبھی تم میری پریشانی دور کرو گے اور کبھی میں تمہاری پریشانی دور کروں گی..... ہاں ان لوگوں کو ہاتھ میں رکھنا۔ اگر ان کے ساتھ ڈھنگ سے دوستی کی جائے تو بہت فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ بہت سی ”بزنس انفارمیشن“ ان کے ذریعے پاس ہو سکتی ہے۔ میری بات سمجھ گئے ناں۔“ مسز ملک کے ہونٹوں پر اور آنکھوں میں مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

اس نے ارسلان کو بطور خاص اپنے فون پر اہم گفتگو کرنے سے منع کر دیا تھا..... ”بالکل ہی بند نہ کر دینا۔ ان لوگوں کو خواہ مخواہ شک پڑ جائے گا.....!“ اس نے نصیحت کے انداز میں کہا۔ دونوں کھانے کی میز پر اکٹھے ہی بیٹھے تھے۔ اس دوران وہ ارسلان سے کرید کرید کر یہی دریافت کرتی رہی کہ ترپاشی اور ملک صاحب کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں۔

”نازنین والا کام بھی الیکشن سے پہلے ہی ہو جائے تو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ایک طرف ملک وفاقی حکومت کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا ہوگا اور دوسری طرف ہمارے ہاتھوں..... میں دیکھوں گی اس کے اعصاب فولاد اور سونے کے کٹنے کھا کھا کر آخر کتنے مضبوط ہو چکے ہیں۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا مسز نجمہ.....!“ ارسلان نے چالپوسی کا انداز اختیار کیا۔

”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“ مسز ملک نے قہقہہ لگایا۔
تھوڑی دیر تک اسے کچھ سمجھاتی رہی اور اب یہاں سے وہ اگلے مشن پر رخصت ہو رہا تھا۔ اس مرتبہ اس کی منزل نازنین کا کوٹھا تھی۔

○

مختار اس بانی نے صدقے داری ہوتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا اور اب نازنین کی باری تھی جو اپنی ماں سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ اس نے مختار اس بانی کے کمرے سے نکلتے ہی ارسلان باؤ کو پلنگ پر گرادیا تھا۔ مختار اس بانی نے بوتلیں لانے میں آدھ گھنٹہ لگا دیا۔ وہ دونوں کو اچھی طرح ”تبادلہ خیالات“ کو موقع دینا چاہتی تھی۔ اس نے ارسلان کے ذریعے ابھی بہت لمبے ہاتھ مارنے تھے۔

جب وہ کمرے میں آئی تو آنکھ کا اشارہ پا کر نازنین باہر نکل گئی۔
”بیٹا ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ اس نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔
”کیا بی بی؟“

”ملک صاحب کی بیٹی نے ساری رات خدمت کی لیکن انعام کوئی خاص نہیں ملا..... یوں تو ایسے لوگوں کی نظر کرم ہی ہم غریبوں پر رہے تو اس سے بڑا انعام کیا ہوگا لیکن پھر بھی.....“ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس نے ارسلان کی طرف دیکھا۔
”بی بی! تم فکر نہ کرو۔ یہ سونے کی مرغی ہے ایک ایک کر کے اس کے سارے اڈے نکال لیں گے، بس ذرا میرا خیال رکھنا..... یہ آدی پیسے کے معاملے میں بڑا کنجوس ہے۔ صرف اس وقت نکالتا ہے جب قابو آ یا ہو..... ورنہ تو سالانہ مفت میں کام چلاتا ہے۔“

”اے بیٹے! تم تو جانتے ہی ہو۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ بیٹی کو روز روز بھیجتا ہماری غیرت گوارا نہیں کرتی۔ وہ تو اس روز بھی..... نازنین کو میں نے زبردستی وہاں ٹھہرایا۔ وہ تو تمہارے علاوہ کسی اور مرد کو خود پر حرام سمجھتی ہے۔“ مختار اس نے اپنی دانست میں اسے بیوقوف بنانا چاہا۔

ارسلان کچھ اور سوچ رہا تھا..... ”ہاں بی بی! دیکھ لو تم نے کوئی زمینداری تو کرنا نہیں۔ اگر ”خانگی“ کی تہمت تم پر لگ گئی تو ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ ایک منصوبہ میرے ذہن میں۔“

چاری کا نندا پوی ہے جو آپ کی یاد میں..... رات بھر کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ اب ایسی بے نیازی بھی کیا ہے حضور۔ اس بے چاری کو فون کر کے ایک آدھ ملاقات ہی کر لیجئے..... دوسری طرف سے نقوی نے بڑی اپنائیت دکھائی۔

”اس کا مطلب ہے واقعی میرا فون بگ ہے کیونکہ ان لوگوں کو بھی علم ہے کہ میں نے کتنا کو فون نہیں کیا۔ اچھا بیٹا! تم بھی کیا یاد کرو گے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور نقوی سے گویا ہوا..... ”ٹھیک ہے مہاراج آج ہی لیجئے۔“

”ارے آج ہی کیا، ابھی کیوں نہیں۔ اس وقت وہ کنیا گھر ہی پر موجود ہوگی اور ہاں یہ نمبر لکھ لو۔ جب کوئی ضرورت ہو خادم کو یاد کر لیتا۔“

نقوی نے ایک نمبر لکھوا کر اس سے دو تین ادھر ادھر کی باتیں کیں اور رابطہ منقطع کر دیا۔ فی الحال اس نے انہیں لوگوں کے اشاروں پر ناچنا تھا..... بستر سے اٹھ کر اس نے سب سے پہلے اپنی جیب سے وہ سلف نکالی جس پر کانتا کے گھر اور بھارتی سفارت خانے کا نمبر لکھا تھا پھر نمبر ملا دیا۔ کسی نے ارسلان کا نام اور فون کرنے کا مقصد دریافت کیا اور اس کی طرف سے جواب ملنے پر سلسلہ دوسری طرف ملا دیا۔

”ہیلو.....!“ اس نے ارسلان کا نام سن کر خوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔
”کپسے ہیں آپ؟ آپ تو ایسے غائب ہوئے جیسے وہ کیا کہتے ہیں اردو میں کہ کس کے سر سے سینک.....“

”مگدھے کے.....“ ارسلان کے فقرہ مکمل کرنے پر اس نے دوسری طرف سے زبردست تہقیر لگایا۔

”گویا آپ خاصے زندہ دل بھی ہیں۔ فون پر بات نہیں بنے گی۔ آئیے ناں کچھ گپ شپ رہے گی۔ میری ایک سیلی آئی ہوئی ہے دلی سے۔ اس سے ملا دو آپ کو..... وہ بھی آپ کی طرح سٹوڈنٹ لیڈر ہے جناب۔“ کانتا کی آواز میں شوخی اور چلبلاہٹ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

”بہت شکریہ آج شام کو ملتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

دونوں نے فون پر گھر پر ہی ملاقات کا وقت طے کر لیا تھا۔

وہ جانتا تھا دوسری طرف اس کے ”دوست“ سن رہے ہوں گے لیکن ”آف دی

اگر ہوشیاری سے اس پر عمل ہو جائے تو تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی قسمت بن جائے گی۔ ساری زندگی عیش سے گزار دوگی۔“ اس نے اپنی آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

”کیا بیٹا.....؟“ مختاراں نے بے قراری سے پوچھا۔

”ابھی نہیں چند روز صبر کر لو..... پارٹی میرے پیچھے لگی ہے۔ لاکھوں کی آفر ہے۔ میں ایڈوانس پکڑے بغیر بات کرنے والا نہیں۔ تم میری بات مانو۔ جیسے بھی ممکن ہو نازنین کو دو تین مرتبہ اور ملک صاحب کے گھر بھیجو۔ ذرا سمجھا کر..... بڑھے کو قابو رکھے۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔“ اس کی باتوں سے مختاراں کی رال منکنے لگی تھی۔

”ارسلان باؤ تم تو ہمارے بھی استاد نکلے۔ واہ بھی واہ! مل کر چلیں گے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

”یہ تو بے بی بی!“

نازنین اندر آگئی تھی.....!

دونوں خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد رات کا کھانا آ گیا۔ یہ دیکھ کر ارسلان حیران رہ گیا کہ آج بی بی نے کھانا اپنے پاس سے منگوایا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ چڑیا نے دانہ چک لیا ہے اور اب وہ اس کے جال سے نکل نہیں سکتی۔

○

صبح اس کی آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز پر کھلی۔

سورج سر پر چڑھ آیا تھا اور وہ ابھی تک حسب معمول لمبی تانے سوراہا تھا۔ فون پر دوسری طرف نقوی صاحب اس سے مخاطب تھے۔ یہ وہی شخص تھا جو چوہدری صاحب کے ساتھ آیا تھا۔ چوہدری نے طلباء کے اغوا کے متعلق ہی باتیں کی تھیں۔ اس نے اپنا موضوع بھارتی سفارت خانے تک محدود رکھا تھا۔

”جناب ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ اس نے بڑے مؤدب لہجے میں کہا۔

”نہیں بالکل نہیں۔ میں اٹھنے ہی والا تھا۔“ ارسلان نے دل ہی دل میں اسے گالی

دیتے ہوئے کہا۔

”واہ جی واہ! ایک طرف آپ ہیں کہ لمبی تان کر سو رہے ہیں اور دوسری طرف بے

لیکن آپ جانتے ہیں ہمارا واسطہ کتنے خطرناک دشمن سے ہے۔ اس لئے بہت ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ بھارتی سفارت کاروں کے ہر مہمان پر نظر رکھیں۔ آپ کا انتخاب صرف ملک و قوم کی خدمت کے لئے کیا ہے۔ اس میں خدا نخواستہ ہمارا کوئی مفاد نہیں۔ نہ ہی آپ کو تکلیف پہنچا کر ہمیں خوشی ملے گی۔۔۔۔۔ اگر آپ اس کام سے انکار بھی کر دیں تو ہم آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، لیکن آپ ایک محب وطن طالب علم لیڈر ہونے کے ناطے مجھے امید نہیں کہ آپ ایسا فیصلہ کریں گے۔“

ارسلان حیران ہی رہ گیا۔ آج تو نقوی کی گفتگو کا انداز ہی بدل گیا تھا اور وہ اس کی اپنے پیروں کی طرح عزت کر رہا تھا۔

”نقوی صاحب! مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں بھی آپ کی طرح پاکستانی مسلمان ہوں۔۔۔۔۔!“

اس نے نقوی کی بات کے خاتمے پر کہا۔

”ششما سے علیحدگی میں گفتگو کا موقع ضرور نکالنا۔۔۔۔۔ اور ہاں اگر اس کی یا کانتا کی طرف سے کوئی آفر ملے تو فوراً قبول کر لینا۔۔۔۔۔ کوشش کرنا کہ کانتا کے دوستوں کو جان سکے۔“

نقوی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

کھانے کے خاتمے پر نقوی نے ایک لفافہ اسے تھما دیا۔

”یہ کیا۔۔۔۔۔؟“

اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ہماری طرف سے حقیر نذرانہ۔۔۔۔۔ گو کہ آپ کو اس کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی ان

لوگوں کو چائے وغیرہ تو پلائی ہوتی ہے۔“ نقوی نے اس کے ”نہ نہ“ کرنے کے باوجود لفافہ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

ہوٹل سے باہر اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے اس نے لفافہ چاک کیا جس میں سوسو کے پانچ نوٹ موجود تھے۔ اس نے عجیب سے جذبات محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر لفافہ دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

اب وہ ملک صاحب کی طرف جارہا تھا۔ اس نے ملک سے اپنے رابطے کا تسلسل بھی نہیں ٹوٹنے دیا تھا کیونکہ اب بھی ملک ہی اس کے لئے سب سے بڑا سہارا بن سکتا تھا۔

ریکارڈ“ کچھ سوچتے ہوئے اس نے نقوی کا نمبر ملایا اور اسے کانتا سے ہونے والی بات چیت لفظ بلفظ سنائی۔

”ونڈرفل۔۔۔۔۔!“ نقوی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔۔۔۔۔ ”آج دوپہر کو اکٹھے ملنے کرتے ہیں۔ چائیز میں آجائیے۔ ایک بجے میں انتظار کروں گا۔“ نقوی نے فوراً ہی اگلی ملاقات طے کر لی تھی۔

معمول کے دو تین کام نمٹا کر جب وہ یونیورسٹی کا چکر لگا کر چائیز پہنچا تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ نقوی ایک کونے میں میز پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔

”سوری مسٹر نقوی! ویری سوری۔۔۔۔۔ جلوس نے بڑی سڑک بلاک کر رکھی تھی اور مجھے پانچ میل کا چکر لگا کر آنا پڑا۔ جب کہ شہر کی ساری ٹریفک کا رخ بھی ادھر ہی تھا۔“

”کوئی بات نہیں ارسلان صاحب۔ مجھے اندازہ تھا۔ میں خود اسی ٹریفک سے گزر کر آیا ہوں۔“ نقوی نے مسکرا کر بات ٹال دی۔

لنچ پر بلانے کا مقصد دراصل اسے بریفنگ دینا تھا۔ نقوی نے کھانے کا آرڈر اس کی مرضی کے مطابق دینے کے بعد اس سے کام کی گفتگو شروع کر دی۔

”مسٹر ارسلان! اگر تم چاہو تو ملک کی بہت خدمت کر سکتے ہو۔ کانتا اپنی جس لڑکی کا ذکر کر رہی ہے اس کا نام ششما بھٹہ چاریہ ہے۔ یہ بڑی ہوشیار لڑکی ہے اور لندن کے بھارتی سفارت خانے میں خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ بظاہر اس کی شہرت ایک سٹوڈنٹس لیڈر کی ہے لیکن اصلیت کچھ اور۔۔۔۔۔ تمہیں اس اصلیت کا ہی پتہ لگانا ہے۔ اس سے خوب کھل جاؤ۔ اسے جی بھر کے سیر کراؤ، گھماؤ پھراؤ۔ اگر ممکن ہو تو کسی بھی طرح اسے اپنے گھر لے آؤ۔ یہ ”گھر“ ہم تمہیں دکھا دیں گے۔ اگر تم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ملک و قوم کے لئے بڑا نیک شگون ہوگا۔“

”لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں اور آپ لوگ الٹا مجھے دھمکانا شروع کر دیں۔۔۔۔۔!! بابا آپ سیکورٹی والے لوگ بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ پہلے ہی آپ نے مجھے اس چکر میں پھانسا ہے۔“ یہ بات اس نے ہنستے ہوئے کہی تھی لیکن نقوی نے اس کا مدعا پالیا تھا۔

”ارسلان صاحب! مجھے بے حد افسوس ہے اگر ہمارے رویے سے آپ کو تکلیف پہنچی

اعتماد میں لے کر بتا دیا ہے کہ لڑکے نجرمانہ سرگرمیوں میں مارے نہ گئے تو واپس آ جائیں گے۔ ویسے ان کے گھر والوں کو اپنے صاحبزادوں کے کرتوتوں کا علم پہلے سے ہی تھا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ زیادہ جیس جیس کی تو پولیس سارے پرانے کیس نکالے گی۔ دو تین برآمدگیاں ہی کروانا پڑیں تو پتہ چل جائے گا..... اور ہاں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی تھی۔“

”جی ملک صاحب.....!“ ارسلان ہمدن گوش ہو گیا۔

ملک صاحب نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف مخاطب کیا..... ”بیٹا! تم جانتے ہی ہو سیاست میں سب سے پہلے اپنا خون سفید ہوتا ہے۔ آستین کے سانپ ڈستے ہیں۔ ہمارا بزنس ایسا ہی ہے کہ اس میں جس نے اعتبار کیا مار کھائی..... میری خواہش ہے کہ تم ”ملکانی“ پر بھی ذرا نظر رکھا کرو..... ایسی کوئی بات ہے تو نہیں..... لیکن تم جانتے ہو ہم دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور عورت ذات کو درغلانا کوئی ایسا مشکل مسئلہ بھی نہیں ہے.....!“ ملک نے مختصر سی بات میں اسے بہت کچھ یاد دلایا تھا۔

○

ارسلان کا دماغ سن ہو کر رہ گیا۔

یہ سیاست کتنا گھناؤنا کھیل بن چکا ہے اس ملک میں۔

اس نے سوچا۔

پھر اسے خیال آیا کہ شاید قدرت نے ملک کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جو اس نے ارسلان پر اندھا دھند اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے دل میں تو خوشی سے لڈو پھوٹ رہے تھے کہ اگر کوئی معمولی سی مشکل بھی درپیش تھی تو وہ آسان ہو گئی۔

”ملک صاحب! آپ بے فکر ہو جائیں۔ سر! میں آپ کے خلاف کوئی سازش پینے نہیں دوں گا..... میں نے آج تک بیگم صاحبہ سے کبھی زیادہ گفتگو نہیں کی۔ اب جیسے آپ مناسب سمجھیں.....!“ اس نے بڑی مکاری سے جواب دیا۔

”اس کا بندوبست ہو گیا ہے۔ میں نے تمہارا بندوبست اسی بنگلے کی ”انیکسی“ میں کر دیا ہے۔ تم ایک دو روز میں یہاں منتقل ہو جاؤ اور بیگم کو بھی کہہ دیا ہے کہ وہ تم پر اعتماد کر سکتی ہے کیونکہ تم گھر کے آدمی ہو۔ تم آج جانے سے پہلے اس سے مل لو۔“

آستین کے سانپ

ملک حسب معمول میٹنگ میں جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ ارسلان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی باجیس کھل گئیں۔ اس نے مختاراں بائی کا نام لئے بغیر ارسلان سے کہا:

”میں نے امیں ایس پی صاحب سے کہہ دیا ہے۔ کسی پولیس والے کی جرأت نہیں کہ اب ان لوگوں کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھے..... اور ہاں بیٹا! دو ایک روز میں اسے پھر کسی روز لانا۔ بڑے کام کی عورت ہے۔ تم تو جانتے ہو میں کتنی زبردست اعصابی جنگ لڑ رہا ہوں آج کل.....!“ انہوں نے بیہودہ سے اشارے سے ارسلان کو سمجھایا۔

”ملک صاحب! فکر ہی نہ کریں۔ وہ تو اپنے گھرے کی مچھلی ہے جب آپ حکم دیں بلا لیں گے.....! سر! وہ اختر جاوید والے کیس کا کیا بن رہا ہے؟“ اس نے کام کی بات بھی دریافت کر لینا مناسب سمجھا۔

”بے فکر رہو۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں پوچھے گا۔ ارے ان کی ہمت نہیں کہ ملک سے ٹکر لے سکیں۔ وہ آئی جی کا چچرہ بڑا پھنسنے خان بن رہا تھا۔ میں نے بھیج دیا ہے اسٹیشنمنٹ میں واپس۔ اب کرے انتظار ریٹائرمنٹ تک اگلی پوسٹ کا۔ بیٹے کو باقی ساری نوکری انتظار ہی میں کاٹنی پڑے گی..... میں نے دونوں کے لواحقین کے منہ بند کروادیئے ہیں اور انہیں

لئے رضا مند کر لے گا۔

سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا جب اس نے بھارتی سفیر کے گھر کی گھنٹی بجائی۔ دروازے پر موجود مسلح گارڈ نے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور کر اس کا نام دریافت کیا اور اسے اندر بلا لیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے علم ہو گیا کہ یہاں شارٹ سرکٹ کیمرہ نصب ہے اور اندر سرکین پر باہر کی ساری سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں، کیونکہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا۔ گارڈ کے کیمین کے اندر موجود انٹر کام کی تیل ہوئی۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا اور اچانک بدلے ہوئے موڈ میں باہر آ گیا۔

”ادھر تشریف لے جائیں سر!“ فون پر ہدایت مل گئی تھی اور اب وہ بڑے مؤدب لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

ہاتھ کے اشارے پر چلتے ہوئے ارسلان نے ابھی پہلی روش ہی عبور کی تھی جب اس نے کانتا کو ایک اور لڑکی کے ساتھ اس طرف آتے دیکھا۔

”ہیلو مسٹر ارسلان! ہاؤ آر یو.....؟“ اس نے اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا کہ ارسلان گڑبڑا کر ہی رہ گیا۔

”یہ ہے میری سہیلی ششما بھٹہ چاریہ..... بہت مشہور سٹوڈنٹس لیڈر ہے بالکل تمہاری طرح۔“

”ہیلو.....!“ ششما نے بھی اپنا دایاں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

تینوں اندر ایک کمرے میں چلے آئے۔ کمرے کی سچ دھج نے ارسلان کو حیران کر دیا تھا۔ یہاں بھارت کے مختلف علاقوں سے متعلق ”ہینڈی کرافٹ“ اور پورٹریٹ موجود تھے۔ شاید یہ لوگ اپنے شکار پھانسنے کے لئے سب سے پہلے اس کمرے میں لاتے تھے کیونکہ ”اجنٹا اور ایلورا“ کی دیواروں پر جو پینٹنگز موجود تھیں ان کا ایک عکس یہاں بھی موجود تھا جس سے نظر ہٹانا کسی بھی نوجوان کے لئے آسان کام نہیں تھا۔

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ مجھے کانتا نے بتایا تھا آپ کی تنظیم بہت لبرل ہے۔ جس ملک میں جمہوریت نام کی چڑیا کا وجود بھی نہ ہو آپ ایسے لوگوں کا دم غنیمت ہے۔

یہ کہہ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ گھریلو ملازمہ دروازے پر حاضر تھی۔

”نیگم صاحبہ کو بلا لاؤ.....!“ ملک نے اسے حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد نیگم صاحبہ وہاں موجود تھی۔ انہوں نے سگریٹ انگلیوں میں دبا رکھا تھا۔ ”تم ارسلان کو تو جانتی ہو۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ بہت اچھا پر خوردار ہے۔ بچہ ہے اپنا..... میں چاہتا ہوں کہ زندگی میں اسے کامیاب انسان بننا دیکھ لوں.....!“ ملک نے اپنی نوبیا ہتا نوجوان بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے میں بھی آج کل شدت سے پی اے کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔ ایکشن بھی سر پر آنے والے ہیں۔ یہاں لڑکیاں ہمارے ساتھ نہیں چل سکتیں۔ میں نے کل آصفہ کی بھی چھٹی کروادی ہے۔ کجنت جہاں کی بڑے آدمی سے ملی اپنی لائن سیدھی کرنے لگتی ہے..... اور بدنامی ہمیں اٹھانی پڑتی ہے..... تم کل تک ”انیکسی“ میں آ جاؤ..... اچھا میں چلوں مجھے تقریر کے پوائنٹس تیار کرنے ہیں۔“ لا پرواہی سے جس طرح وہ اندر آئی تھی اسی طرح باہر چلی گئی۔

”میں چلتا ہوں..... کل پرسوں تک اپنا سامان لے آنا۔ اس فلیٹ میں سکندر اور اقبال کو بھیج دو۔“ ملک صاحب نے باہر نکلے ہوئے کہا۔

”جو حکم سر.....!“ اس کے لئے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نجمہ ملک کے سامنے موجود تھا جس کے چہرے پر فتح مندانہ مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

”میں نے کہا تھا ناں کہ سیانا کو ہمیشہ گندگی پر گرتا ہے۔ ملک لاکھ ہوشیار چالاک سہی لیکن اتنا بھی نہیں جتنا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ اب تم میرے پی اے کی حیثیت سے بھی کام کرو گے اور انٹیلی جنس والوں کی جرأت نہیں کہ وہ اس دروازے کے نزدیک بھی پھٹک سکیں۔ ملک صاحب کا اپنے مسلح سپاہیوں کو حکم ہے کہ مشتبہ شخص کو بلا درلغ گولی مار دو۔“

نجمہ ملک نے تو کہہ دیا تھا لیکن اب ارسلان اپنا الگ کھیل شروع کرنے جا رہا تھا۔ وہ اس مرحلے پر اپنی جنس والوں کی دوستی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے شام کے پروگرام کی اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے وہ رخصت ہو گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مسز ملک کو بتائیں کہ بانی کروادی تھی کہ مختار اباں بانی دالاشن ضرور مکمل ہو گا اور وہ ماں بیٹی کو اس کام کے

مہر دوست ہے حالانکہ وہ عمر میں کسی طرح اس کے باپ ترپاشی سے کم نہیں رہا ہوگا۔
چیف رپورٹر نے ارسلان کو پہچان لیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ شناسائی نہیں
رکھتے تھے لیکن کتنا ترپاشی نے دونوں کا بھرپور تعارف کروادیا۔

”ہمارے بہت اچھے دوست ہیں آپ کی طرح!“ اس نے چیف رپورٹر سے کہا۔
”تفصیلی گفتگو تو پھر کبھی ہوگی میں تو ادھر سے گزر رہا تھا سوچا ہیلو کر لوں۔“
چیف رپورٹر نے وضاحت پیش کی کہ اسے کسی پریس کانفرنس میں جانا تھا۔
”جناب آپ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں لیکن آج ہمارے ساتھ پیگ لگائے
بغیر نہیں جاسکیں گے۔“ اس نے اس کے لئے بیڑا اٹھیلے ہوئے کہا۔
”دوستی کے نام پر۔۔۔۔۔!“ سب نے ایک مرتبہ پھر جام کھرائے۔
”آپ کے لئے اس مرتبہ بڑا خاص تحفہ آیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے کتنا دوسرے کمرے
میں چلی گئی۔

جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بھارتی دھڑکی کی دو بوتلیں پکڑی ہوئی تھیں۔
چیف رپورٹر نریندرے بچوں کی طرح دانت نکال رہا تھا۔۔۔۔۔ اس نے درجنوں مرتبہ شکریہ تھینک یو
دھنوا اور نجانے کیا کیا کہہ کر بوتلیں بغل میں دبائیں اور آدھی کی طرح آنے والے طوفان کی
طرح لوٹ گیا۔

تینوں اسے گاڑی تک چھوڑنے آئے تھے جو اندر پورچ میں پارک کی تھی۔ بڑا سیانا
رپورٹر تھا۔ اس نے دونوں بوتلیں ڈگی میں اس طرح چھپائی تھیں کہ تلاشی لینے پر بھی نظر نہ آئیں۔
”او کے مسٹر ارسلان! ضرور ملے گا اور کوئی بھی خدمت ہو تو ضروری یاد کیجئے گا۔ ہم تو
یاروں کے یار ہیں۔۔۔۔۔!“ یہ کہہ کر اس نے بے تکلفی سے کتنا کے جسم پر ہاتھ مارا اور گاڑی میں بیٹھ
کر چلا گیا۔

ارسلان حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ کیا مجال جو اس کے چہرے پر تاسف یا شرمندگی کا
کوئی شائبہ تک موجود ہو۔

”ڈنر تو پارک وئے“ میں کریں گے۔“ کتنا نے کہا۔
”او کے۔“ ششما نے رضامندی ظاہر کی۔

مسٹر ارسلان! ہمیں اب دین دھرم سے بلند ہو کر سوچنا ہوگا۔ یہ دنیا بہت بڑی اور
انتہائی مختصر بھی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے نفرت کی دیواریں اتنی اونچی اٹھادی ہیں کہ ہمارا کام
بہت بڑھ گیا ہے۔۔۔۔۔ جنگ ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ ہمیں محبت بانٹنی ہے تاکہ جوئل ہمارے
بعد آئے وہ ہمارے متعلق ایسا نظریہ قائم نہ کرے جیسا ہم اپنے بزرگوں سے متعلق سوچتے ہیں۔“
اس نے میٹھا زہر ارسلان کے ذہن میں اتارنا شروع کیا۔

”ہوگئی شروع تقریر۔ بس تمہارا ایڈیٹر لوگوں کو یہی المیہ ہے کہ جہاں سامعین میسر آئے
تقریر شروع کر دی۔ کچھ ہمیں بھی باتیں سننے کا موقع دوگی۔۔۔۔۔“
اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی مؤدب و میٹر مشروبات کی ٹرائی اندر دھکیل کر اگلے
قدموں لوٹ گا۔

”یہ ہمارے بھارت کی نمبرون بیڑ ہے۔۔۔۔۔!“ کتنا نے برف کے ٹکڑے بھرے گلاس
میں بیڑا اٹھیل کر گلاس اسے تھما دیا۔

”تھینک یو۔۔۔۔۔!“ ارسلان نے گلاس پکڑ کر ششما کے اور نزدیک بیٹھے ہوئے کہا۔
تینوں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ ارسلان اندازہ کر سکتا تھا کہ نامحسوس
انداز میں وہ نہ صرف ان کے دل و دماغ میں پاکستان کے خلاف نفرت کا زہر اٹھیل رہی تھیں بلکہ
اس کے منہ سے بھی بہت سی باتیں کھلوا رہی تھیں۔ اس درمیان ترپاشی اور اس کی بیوی بھی وہاں آ
گئے تھے۔ انہوں نے چند منٹ بیٹھ کر ان کے ساتھ ”ڈرنکس شیر“ کئے اور کسی ملک کے سفارت
خانے کی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے واپس چلے گئے۔

ششما نے اسے بتایا تھا کہ وہ لندن میں ایک ڈپلومہ کورس کر رہی ہے۔ اس نے
ارسلان کو لندن اور بھارت کے اپنے ایڈریس اس وعدے کے ساتھ دیئے تھے کہ وہ اسے ضرور
میزبانی کا شرف بخشے گا۔

○

کتنا دوسرے کمرے سے ٹیلی فون کی آواز پر اٹھ کر باہر گئی جب وہ واپس آئی تو اکیلی
نہیں تھی۔ ایک اور شخص بھی اس کے ساتھ موجود تھا اور یہ کوئی اجنبی شخصیت نہیں تھی۔ ارسلان کے
لئے یہ چونکا دینے والی بات تھی کہ مقامی اخبار کا چیف رپورٹر بھارتی سفارت کار کی بیٹی کا ذاتی اور

O

صبح اسے سب سے پہلے نجمہ بیگم نے ہی طلب کیا تھا۔ وہ ناشتے کی میز پر اس کی منتظر تھیں اور یہ اطلاع اسے گھریلو انٹرکام پر نجمہ بیگم سے ملی تھی۔ تین گھنٹوں کے بعد وہ بیدار ہوا تو دوسری طرف سے بیگم نجمہ نے اس سے دریافت کیا..... اور جب اس نے بتایا کہ صبح کے نو بج رہے ہیں تو ارسلان کچھ شرمندگی ہی محسوس کرنے لگا۔

”اگر تم دوپہر سے پہلے ناشتہ کرنا پسند کرو تو پندرہ بیس منٹ تک آنا.....!“ اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

پندرہ منٹ سے پہلے وہ ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ ملک صاحب کل شام دارالحکومت گئے تھے اور وہاں دو تین روز قیام کرنے کے بعد ہی انہوں نے واپس آنا تھا۔ اس مرتبہ پارٹی کی مرکزی کمان نے اپنے خصوصی اجلاس کے لئے ملک کے ہر حصے سے اہم سیاسی شخصیات کو مدعو کیا تھا جن میں ملک صاحب سرفہرست لوگوں میں شامل تھے۔ اس مرتبہ چونکہ نئی نازدگیاں ہونی تھیں اس لئے اجلاس دو تین روز جاری رہ سکتا تھا۔

ارسلان کو بے کلی سے لگی ہوئی تھی۔ وہ جلد از جلد نجمہ اور سجاد خان کے تعلقات کی اہمیت جاننا چاہتا تھا لیکن خود سے کوئی سوال کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی اور اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ بیگم نجمہ خود ہی اس موضوع پر بات کرے۔

نجانے اس کی بات کا کیا مطلب لیا جائے؟
”کیسی رہی کل کی ملاقاتیں.....؟“ اس نے ارسلان سے اچانک ہی پوچھا اور وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

کیا اسے میرے کل کے پروگرام کا علم تھا؟ حالانکہ اس نے خود نجمہ بیگم سے کچھ نہیں کہا تھا۔ عین ممکن ہے اس نے بھی ارسلان کو ہوٹل میں دیکھ لیا ہو۔ اگر اس کی نظر نجمہ پر پڑ سکتی ہے تو نجمہ بیگم کی نظریں بھی اس پر پڑ سکتی تھیں۔

جھوٹ بولنا اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔

”کل میں ذرا کانٹا کی طرف نکل گیا تھا۔ ایسا کوئی پروگرام تو نہیں تھا لیکن وہاں دیر لگ گئی اور وہ لوگ بھند تھے کہ میں ڈنران کے ساتھ کروں۔ ادھر سے بھی فراغت تھی اس لئے میں

تینوں ارسلان کی کار میں جو اسے ملک صاحب نے استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی تھی بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ کھانا خاصا پر تکلف تھا۔ ارسلان کے بھند ہونے کے باوجود بل کانتا نے ادا کیا تھا۔ یہاں کے ویٹر بھی شاید اسے پہچانتے تھے کیونکہ سارا عملہ کھینوں کی طرح تمام وقت ان کے گرد ہی جھنبھناتا رہا۔

کھانا کھا کر جب تینوں باہر نکلے تو ہوٹل میں ایک پجوارو جیب داخل ہو رہی تھی اور جب جیب کے ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو ارسلان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس میں سے بین الاقوامی سنگرز سجاد خان اور مسز نجمہ ملک برآمد ہوئے تھے..... آج کا یہ دوسرا اور اس کی زندگی کا شاید بہت بڑا ”سرپرائز“ تھا جو اسے ملا۔

اپنی کار میں بیٹھنے تک وہ پلٹ کر بار بار دونوں کو دیکھتا رہا۔
”کوئی دوست ہیں آپ کے؟“ ششمانے اس کی پریشانی نوٹ کر لی تھی۔
”نہیں! میں سوچ رہا تھا انہیں کہیں دیکھا ہے۔“ اس نے بات ٹالنے کے انداز میں کہا۔

”ویل مسٹر ارسلان کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں بھی دیکھ کر آپ ایسا سوچنے لگیں۔“
”ارے نہیں مس! آپ کوئی بھولنے والی ہستی تھوڑی ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ایکشن میں چابی گھمائی۔

دونوں کو گھر ڈراپ کر کے جب وہ رخصت ہونے لگا تو ایک مؤدب ملازم نے داسکی کی ایک بوتل اس کے ساتھ والی سیٹ پر رکھ دی تھی۔

”ہماری دوستی کے نام پر..... انجوائے یور سیلف۔ بائے بائے۔“ کانتا اور ششمانے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

دونوں ہاتھ ہلاتی اندر چلی گئیں۔ حیران و پریشان ارسلان نے ایک سیلیئر دیا یا اور کار کو ہوا کے دوش پر اڑا تا گھر آیا۔ اس نے اپنے اندر والے شیشے سے ایک جیب کو اپنے مسلسل تعاقب میں دیکھ لیا تھا لیکن اسے اس بات کی پروا نہیں تھی۔ عین ممکن ہے یہ لوگ اس کی حفاظت کر رہے ہوں۔ اپنے بستر پر گرتے ہوئے وہ مسز ملک کے اس روپ کے متعلق سوچتا رہا اور جب کسی نتیجے پر نہ پہنچا تو کروٹ لے کر نیند کا انتظار کرنے لگا۔

نے.....

اس نے نظریں مکھن کے ٹوسٹ پر جماتے ہوئے وضاحت کرنا چاہی۔

”ارے اس میں شرمائے کی کیا بات ہے؟ کہیں شرمائے والا کام تو نہیں کیا؟“ اس نے

ارسلان کی بات کاٹتے ہوئے نامکمل سی بات کہہ دی۔

”نہیں، نہیں.....!“ ارسلان بے اختیار ہنس دیا۔

اس کے اعصاب خاصے پرسکون ہو رہے تھے۔

”نازنین والا کام جلد ہو جائے تو اچھا ہے۔ اگر ہم نے الیکشن سے پہلے یہ کام کر لیا تو

سمجھ لینا لڑے بغیر ہم الیکشن جیت گئے۔“ نجمہ بیگم نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”آپ بے فکر رہیں۔ میں نے ان سے اشارت بات کی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ انکار

کریں گے۔ پیسہ ان لوگوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔“

”ہاں! تم نے سچ کہا۔ واقعی کمزور انسانوں کی پیسہ سب سے بڑی کمزوری بن جاتا

ہے۔“

اس نے اب سگریٹ سلگا لیا تھا۔ ایک طویل کش لے کر دھوئیں کے مرغولے فضا میں

بکھیرنے کے بعد اس نے دھوئیں پر نظریں جماتے ہوئے ارسلان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”تم پاسپورٹ کیوں نہیں بنا لیتے..... اس کی ضرورت تو ہمارے بزنس میں ہر وقت

رہتی ہے۔ بھی دنیا کو دیکھو گے نہیں تو سمجھو گے کیسے؟“

”لیکن میرے لئے یہ کیسے ممکن ہے؟“ ارسلان کو اس بات سے واقعی خوشی ہوئی تھی۔

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا..... ”تم فارم بھر کے امجد صاحب کو

دے آنا۔ باقی میں خود دیکھ لوں گی۔“

امجد ملک صاحب کے وکیل کا نام تھا جس کو تنخواہ ہی ”ہنگامی حالات“ سے نمٹنے کی دی

جاتی تھی۔

”شکریہ۔“ ارسلان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

تب اس کے ذہن میں دور دور تک یہ بات نہیں تھی کہ بیرونی ممالک کی یہ سیر اسے

کیوں کروائی جا رہی ہے۔

یہ بات وہ ضرور سمجھتا تھا کہ اگر یہ نجمہ ملک کی کسی سیکم کا حصہ ہے تو وہ کبھی اسے اندھے

کنوئیں میں نہیں دھکیلے گی بلکہ اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دے گی۔

پھر اس کے ذہن میں ایک لمحے کے لئے یہ خیال بھی آیا کہ سجاد خان سے نجمہ ملک

کی دوستی کا پس منظر کہیں یہ غیر ملکی دورے تو نہیں؟ وہ جانتا تھا کہ ایک چکر ہیر و دن سمیت اگر کامیابی

سے لگایا جائے تو دوا رہے نیارے۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ مسز ملک نے اسے اب کوئی ایسی مہم سونپی

ہو۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ مسز ملک نے اسے خاموشی سے چائے کی پیالی کو گھورتے

ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”جی کچھ نہیں.....!“ وہ کھسیانی ہی ہنسی ہنس دیا۔

”میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو..... مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ تم نے مجھے

سجاد خان کے ساتھ دیکھ لیا ہے، کیونکہ میں نے بھی تمہیں دروازے سے نکلنے دیکھا تھا..... دیکھو

ارسلان! اب ہم بزنس پارٹنر ہیں۔ ہم نے جس کھیل کے میدان میں قدم رکھا ہے وہاں کے کوئی

لگے بندھے اصول نہیں ہیں۔ یہاں ”بائی بک یا بائی کروک“ جیسے بھی ہو آگے نکلنے کی جگہ بنانی

پڑتی ہے۔ سیاست کے گھناؤ نے کھیل سے اور بھی بہت سی قباحتیں وابستہ ہیں۔ یہ لوگ جو برف

کیس بھر بھر کر روپیہ لٹاتے ہیں کوئی اپنے آباؤ اجداد کی زمینیں فروخت کر کے روپیہ نہیں لاتے۔ یہ

سب بلیک منی ہے یا پھر سرکاری بینکوں سے لوٹا ہوا روپیہ..... اور اس کا حصول تب ہی ممکن ہے

جب ہم اپنے ضمیر اور نام نہاد شرافت کو ایک طرف رکھ کر سوچیں۔ سجاد خان اس ملک کا ہی نہیں

دنیا کا مانا ہوا سنگمر ہے۔ اس نے ہیر و دن کے پیکنوں سے سونے کے محلات کھڑے کئے ہیں۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ سجاد خان سنگمر ہے لیکن مجھے بتاؤ کہ اس ملک کا کون سا حکمران سیاستدان

یا بڑا آفیسر ہے جو اس کی دوستی کا محتاج نہ رہتا ہو؟ یہ لوگ سجاد خان کو اپنی نجی محفلوں میں بلانے

کے لئے کیا کیا گھٹیا حرکتیں کرتے ہیں تم تصور نہیں کر سکتے۔ تم جانتے ہو یہاں کے مقامی حکمران

نے ایک مرتبہ کتنی حسرت بھری آواز میں ساتھیوں سے یہ کہا تھا کہ سجاد خان صاحب اس کی

دعوت قبول نہیں کرتے..... جب یہ لوگ وفادار کتوں کی طرح اس کے قدموں میں بچھے رہتے ہیں

تو ہمیں اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے برابر کھڑے ہو کر اس سے تعلقات قائم رکھنے میں اعتراض

گرمیوں کی خوشگوار شام کا ٹھنڈا اور فرحت بخش ذائقہ ارسلان کو اپنی نس میں سماتا محسوس ہوا۔ باغ کے مختلف کونوں کھدروں میں کسی انجانے خوف سے سہمے سٹے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے جوڑے ایک دوسرے کو مستقبل کے سنہرے خواب دکھا رہے تھے۔ یہ سب اپنے گھروں سے جھوٹ بول کر یہاں آئے تھے۔ اپنے نزدیک قدموں کی آہٹ پر وہ خوفزدہ ہرنوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے، پھر کسی کو سر پر موجود نہ پا کر کھیانے انداز میں دوبارہ جو گفتگو ہو جاتے۔

باغ کی مصنوعی پہاڑیوں پر سالوں سے سایہ فگن درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندوں کی آوازیں اب آہستہ آہستہ دم توڑنے لگی تھیں۔ کسی فوارے سے کبھی پانی دھار کی صورت برآمد ہوتا پھر چپ سادھ لیتا۔

جان توڑ گرمی اور ساون بھادوں کے شدید جس کے بعد اب شام کو درختوں سے سرسراہٹ والی ٹھنڈی ہوائ نے یہاں معمول کی سیر کو آنے والوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ ارسلان بھی یہاں خود پر مسلط گھٹن سے نجات محسوس کر رہا تھا۔ کینٹین والا شاید نقوی صاحب کو جانتا تھا۔ اس نے چائے اپنے پاس محفوظ برتنوں میں سجا کر ان کے سامنے رکھ دی اور خود واپس لوٹ گیا۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ارسلان نقوی کو کانتا کے ہاں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔ اس نے اپنی دانست میں چیف رپورٹر کی وہاں آمد اور بھارتی سفیر کی بیٹی سے اس کی بے تکلفانہ دوستی کی تفصیلات بتا کر چونکا دینے والی بات کی تھی۔

لیکن.....!

وہ حیران ہی رہ گیا کہ نقوی صاحب کو ان تمام باتوں کا پہلے سے علم تھا اور انہوں نے اس پر کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا، حالانکہ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس انکشاف سے وہ نقوی صاحب کو چونکا کر رکھ دے گا۔

اس نے نقوی صاحب کو ملاقات کی ایک ایک تفصیل بتائی تھی۔ ارسلان نے محسوس کیا تھا کہ یہ لوگ کانتا سے زیادہ دلچسپی اس کی لندن والی دوست شمشا بھٹہ چاریہ میں لے رہے تھے۔ شاید یہ لڑکی لندن میں بھارتی انٹیلی جنس کے لئے کام کرتی رہی ہے۔ اس نے سوچا۔

”کسی طرح اپنے دوستوں کو سیر کروانے گھر پر لے آؤ تو خوب مزہ رہے۔“ نقوی نے

نہیں ہونا چاہئے..... جب تم میرے ہمراہ اس سے ملاقات کرو گے تو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لو گے کہ قابل نفرت سجاد خان ہے یا ملک صاحب جیسے معزز اور معتبر شہری.....؟“

ارسلان اندازہ کر سکتا تھا کہ اس عورت میں کتنا زہر بھرا ہوا ہے..... وہ جان سکتا تھا ایسی زہریلی عورت جب ملک کوڈ سے گی تو اسے شاید اگلے سانس کی مہلت بھی میسر نہ ہو سکے۔

متوسط گھرانے میں جنم لینے والی نجمہ نے..... ایسی بھیا تک اور مکروہ زندگی کا کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ جانے اس ملک کے ملک صاحبوں نے ایسی کتنی معصوم لڑکیوں کے اذہان میں زہر بھر کر انہیں عورت کے عظیم منصب سے گرا کر انسانیت کی سطح سے بھی گرا دیا ہے۔ ملک واقعی کسی کڑی سزا کا مستحق تھا۔

○

اس روز شام کو نقوی صاحب کا ٹیلی فون آ گیا۔ وہ فوراً ملاقات کے خواہش مند تھے۔ ارسلان نے محسوس کیا کہ نقوی صاحب فون پر گفتگو کرنے سے احتراز برت رہے تھے، کیونکہ انہوں نے فون اس کے نئے ٹھکانے پر کیا تھا۔ نقوی نے اسے ملاقات کی جگہ بتا دی تھی اور اب وہ اسی طرف جا رہا تھا۔

نقوی صاحب بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی وہ بلائیں لینے کے انداز میں ارسلان کی طرف لپکے۔

”ویل ڈن..... وغر فل۔ شاندار۔ کمال کر دیا بھی..... مان گئے ارسلان صاحب آپ کو۔ یار تم نے سالی پر جادو کر دیا ہے۔“ انہوں نے ایک ہی سانس میں نجانے کیا کچھ کہہ دیا۔

”شکریہ نقوی صاحب! یہ میرا فرض تھا۔“

دونوں یہاں سے پیدل ہی نزدیکی باغ کی طرف چل دیئے جہاں ایک کونے میں رکھے پتھر کے بیچ پر نقوی صاحب کی قماش کا کوئی دوسرا آدمی پہلے سے موجود تھا۔

”تم جاؤ کینٹین والے سے یہاں چائے پہنچانے کو کہہ دینا۔“ انہوں نے اس شخص سے کہا جس نے ابھی ارسلان کی طرف غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔

حکمن کروہ چل دیا۔ دونوں اس بیچ پر بیٹھ گئے۔

شام کا ملگجا اندھیرا باغ کے درختوں سے اب گھاس پر اترنے لگا تھا۔ رخصت ہوتی

دیر گئے تک وہ باتیں کرتے رہے پھر نقوی اسے اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ اس مرتبہ وہ شہر کی ایک ماڈرن آبادی کے فلیٹ میں پہنچے تھے۔ دو بیڈرومزاور ڈرائنگ ڈائننگ پر مشتمل شہر کی اس متمول آبادی میں موجود یہ فلیٹ بڑے قیمتی سامان سے آراستہ تھا۔ نقوی صاحب نے اسے فلیٹ کا مکمل "تعارف" کروانے کے بعد ایک چابی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جب بھی تم اپنے مہمانوں کو یہاں لانا چاہو اس گھر کے دروازے کھلے پاؤ گے۔ یہاں کا فرق ہر وقت اشیاء ضرورت سے بھر رہا ہے۔"

ارسلان نے مسکراتے ہوئے چابی اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ اب وہ اچھی طرح سے سمجھ گیا تھا کہ نقوی صاحب نے "مہمانوں" کو خاص طور سے یہاں مدعو کرنے کے لئے کیوں کہا تھا۔

○

انکسٹر اکرم آج پھر دونوں اغوا کنندگان کے گھروں کے چکر کاٹ رہا تھا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے پہلے اختر کے گھر والوں پر قسمت آزمائی کی تھانی۔ اسے ان لوگوں سے کچھ باتیں آن دی ریکارڈ کھلوانی تھیں۔ اس مرتبہ اس نے اختر کے باپ مولوی اشفاق صاحب کو دفتر سے واپسی پر گھیر لیا تھا۔

مولوی اشفاق ریلوے آفس میں سینئر کلرک تھے اور جتنا بیٹا خراب اتنا ہی باپ نیک اور اچھا انسان..... اس سے پہلے بھی اکرم ان سے مل چکا تھا۔

"مولوی صاحب! بخدا میں آپ کو بار بار تنگ کر کے آپ کے زخم کرایدنا نہیں چاہتا" لیکن میری یہ خواہش ضرور ہے کہ آپ کے بیٹے کو اگر وہ اس دنیا میں موجود ہے جلد از جلد آپ تک پہنچاؤں۔ اس کے علاوہ بار بار ملاقات کا اور کوئی مقصد نہیں۔" اس نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا کہ مجبور باپ کی بے کسی اور الم نصیبی کا اندازہ وہ لگا سکتا تھا۔

"میں تمہارے جذبہ کی قدر کرتا ہوں بیٹا۔ لیکن تمہارے ہر سوال کا جواب میں متعدد مرتبہ دے چکا ہوں..... میرے پاس بتانے کو اور کچھ نہیں ہے.....!" انہوں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"دیکھئے بزرگوار! میں جانتا ہوں آپ کچھ چھپا رہے ہیں..... مجھے حیرت ہوتی ہے کہ

بالآخر وہ بات کہہ ہی دی جس کے لئے وہ جانے کب سے ذہنی طور پر تیاری کر رہا تھا۔

"کوشش! کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ اس سے پہلے یہ سب کچھ کہاں تھا جواب ہے..... بھئی ارسلان صاحب جو آج ہے وہ کل نہیں تھا اور جو کل ہوگا وہ آج نہیں ہے۔ وہ کیا کہا ہے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے۔"

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہو گا

نقوی صاحب کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چپک گئی۔

"آپ نے مجھے کس آج کل کے چکر میں پھنسا دیا۔ جناب! بے فکر رہنے میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی توقعات پر پورا اتر سکوں" ارسلان نے اس کی فلسفیانہ گفتگو کو روکتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ارسلان! چیف رپورٹر جیسے بہت سے لوگ ابھی تمہیں ملیں گے۔ یہ لوگ شراب کی ایک بوتل کے لئے غیر ملکی عورت کی چند منٹ کی صحبت کے لئے کہاں تک گر سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ بھی تمہیں اچھی طرح ہو جائے گا۔ جب میں نے سروس جان کی تھی تو ایک مشن لے کر آیا تھا لیکن بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ میں پرلے درجے کا احمق ہوں..... مجھے اپنی سوچ پیشہ ورانہ بنانی چاہئے۔ اگر میں نے اپنی "ڈیوٹن" (devotion) کو اس میں شامل کر لیا تو کسی کام میں کچھ نہیں بگاڑ پاؤں گا..... ہاں میری اپنی سروس فائل کا حلیہ ضرور بگڑ جائے گا۔"

ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے سگریٹ سلگایا تو سگریٹ لائٹر کی روشنی میں ارسلان نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں کردٹیں لیتی کرب کی لہروں کو اتنا ہی شدت سے محسوس کیا جس شدت سے نقوی خود گزر رہا تھا۔

"ارسلان صاحب! بسا اوقات جی چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے کھڑے کر ڈالوں جو مادر وطن کی عصمت پر کلنک کا ٹیکہ بن جاتے ہیں، لیکن میں صرف رپورٹ کر سکتا ہوں۔ میں کیا میرے جیسے معیولی آفیسر کی تو حیثیت ہی نہیں۔ یہاں تو بڑے بڑے جے ڈی ان لوگوں کا کچھ نہیں کر پاتے۔"

ارسلان کو بے حد افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے چیف رپورٹر کا ذکر کیوں چھیڑ دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ نقوی جیسے ایمپلائر ایکوٹیٹی آفیسر کا دم قدم نہ ہو تو اس ملک کا خدا ہی حافظ۔

”اختر نے خود بتایا تھا۔ اس پر جو دو تین کیس تھے وہ بھی ملک صاحب نے ہی ختم کروائے تھے۔ ورنہ میری کیا مجال تھی۔ ایک مرتبہ جب سے کسی جگہ گولی لگی تھی تو بھی ملک نے ہی اس کا علاج کروایا تھا۔“

”آپ کبھی خود ملک صاحب سے ملے ہیں؟“

”صرف ایک مرتبہ جب چند روز پہلے انہوں نے خود مجھے گھر بلایا اور تسلی دی تھی کہ وہ اختر کو جلدی ڈھونڈ نکالیں گے اور مجھے خاموش رہنے اور پولیس کو کوئی بیان نہ دینے کی ہدایت کی تھی۔“

”یہ کب کا واقعہ تھا.....؟“

”مجھے تاریخ تو یاد نہیں البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ ان دنوں نو جوان کافی ہنگامہ آرائی کر رہے تھے۔ اس روز مجھے اور نواز کی والدہ کو ملک صاحب نے اپنے گھر بلایا تھا۔ نواز کا باپ تو کسی دوسرے ملک میں ہوتا ہے۔ اس کے گھریلو حالات کچھ ایسے برے بھی نہیں لیکن مجھے ملک صاحب نے دس ہزار روپے برحق تھما دیے تھے..... بیٹا! وہ رقم جوں کی توں رکھی ہے۔ میں مرتا مر جاؤں گا مگر حرام کا ایک پیسہ اپنے گھر نہیں آنے دوں گا..... اگر میں اس وقت ملک صاحب کو انکار کر دیتا تو اس کے نتائج میرے حق میں اچھے نہ نکلتے۔“

انسپکٹر اکرم اب خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اپنے کوٹ کی جیب میں چھپائے ٹیپ ریکارڈر میں اس نے ساری گفتگو ریکارڈ کر لی تھی۔ اس کا رگڑاری سے وہ چوہدری صاحب کو خوش کر سکتا تھا۔

اس نے مولوی اشفاق احمد کو یقین دلایا تھا کہ ان دنوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ہمیشہ راز رہے گی اور انہیں ہدایت کی تھی کہ فی الوقت وہ صرف ملک کی ہاں میں ہاں ملائے رہیں اور کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے ملک صاحب کو ان پر شک گزرے۔ اس نے مولوی صاحب کو ایک فون نمبر دیتے ہوئے تلقین کی تھی کہ اگر کسی بھی مرحلے پر اس کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ اسے ضرور یاد کریں۔

مولوی صاحب سے اس نے اختر کے دو چار خاص دوستوں کے کوائف بھی لے لئے تھے اور اب مزید کامیابیوں کی امید کے ساتھ اس کے ایک دوست بابر کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

اپنے بیٹے کی زندگی پر کسی دھمکی یا لالچ کو ترجیح دیتے ہیں۔“ انسپکٹر اکرم نے یہ بات کہہ کر جیسے مولوی صاحب کی دکھتی رگ کو اچانک ہی چھیڑ دیا ہو۔ وہ پھٹ پڑے۔

”کاش تمہاری کوئی جوان بیٹی ہوتی اور تمہیں دھمکی دی جاتی کہ اگر کوئی التماسیدھا بیان دیا تو اسے اغوا کر لیا جائے گا۔ پھر میں تمہیں پوچھتا کہ.....“ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ ان کا گلارندھ گیا۔

انسپکٹر اکرم کا دل بھر آیا۔ اس نے مولوی صاحب کو تسلی دی اور انہیں یقین دلایا کہ ان کی کبھی ہر بات صرف اس کے محکمے تک محدود رہے گی اور وہ عام پولیس والوں کی طرح کبھی انہیں تنگ نہیں کریں گے۔ اس نے مولوی اشفاق صاحب کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنا بیان لکھ کر دے دیں۔

مولوی اشفاق نے بھی آج سارے معاملات خدا پر چھوڑ دیے۔ وہ دیندار آدمی تھے۔ ساری زندگی انہوں نے بہت ”ریزرو“ رکھ کر گزاری تھی۔ خدا جانے کس بری گھڑی اختر نے ان کے ہاں جنم لیا تھا کہ جس کی وجہ سے مولوی صاحب کو تھانہ کچہری بھی دیکھنا پڑ جاتا تھا۔

انہوں نے تفصیلاً سارے واقعات گوش گزار کر دیے۔ انہیں اس بات کا علم ہی نہ ہوسکا کہ ان کے اور انسپکٹر اکرم کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔ مولوی صاحب نے بتایا کہ جب سے اختر نے انقلابی طلباء تنظیم میں شمولیت اختیار کی گھر سے اس کا رابطہ قریباً ختم ہو گیا تھا اور وہ ہوشل میں رہنے لگا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ دو تین مرتبہ پولیس نے ان کے گھر پر بھی چھاپہ مارا اور ایک دفعہ تو وہ اتنے مجبور ہو گئے کہ اس روز روز کی ذالت سے بچنے کے لئے اسے باقاعدہ اخبار میں اشتہاد دے کر عاق کرنے کا پروگرام بنایا بیٹھے تھے، لیکن اس کی ماں آڑے آ گئی۔

”بیٹا! میری چار بیٹیاں ہیں اور ایک ہی بیٹا ہے۔ لوگ زینہ اولاد کے لئے خدا سے جانے کیا کیا التجائیں کرتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کاش خدا نے مجھے اختر کی جگہ بھی بیٹی ہی دے دی ہوتی۔ کم از کم پھر پولیس میرے گھر کا دروازہ نہ دیکھتی۔ اختر نے تو مجھے جیتے جی مار ڈالا..... خدا بیڑہ غرق کرے اس ملک صاحب کا جو ہر مرتبہ آڑے آتا اور اسے قانون کی گرفت سے بچا لیتا ہے۔“

”آپ کو اس بات کا علم کیسے ہوا؟“ اکرم نے درمیان میں ہی انہیں ٹوک دیا۔

C

انٹیلی جنس کے افسر کو سامنے دیکھ کر بابر کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے سنا تھا کہ یہ لوگ تو بندے کو ایسے غائب کرتے ہیں کہ اس کا پھوکھوسی پتہ ہی نہیں چلتا۔ ایک مرتبہ اختر نے ہی اسے بتایا تھا کہ جیسے ان لوگوں نے اپنے خفیہ مارچریل بنارکھے ہیں جہاں وہ مخالف طلبہ تنظیم کے نوجوانوں کی تفتیش کرتے ہیں اسی طرح انٹیلی جنس والوں نے اپنے خفیہ عقوبت خانے بنارکھے ہیں اور جس شخص کو ایک مرتبہ یہ لوگ غائب کر دیں وہ پھر مشکل ہی سے گھر لوٹتا ہے۔

”دیکھو میاں تم مجھے شریف گھرانے کے معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا باپ بھی سرکاری ملازم ہے اور تمہارے گھریلو حالات بھی تم سے ڈھکے چھپے نہیں۔ تمہاری ایک بہن طلاق لے لے کر گھر آن بیٹھی ہے اور دوسری دونوں شادی کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی ہیں..... ہمیں ہر بات کا علم ہے کہ تمہارا بڑا بھائی شادی کے بعد والدین کو چھوڑ گیا ہے۔ ان حالات میں اگر تمہاری وجہ سے تمہارے والدین کو کوئی صدمہ پہنچا تو تمہارا والد خودکشی کر لے گا۔ اس کے بعد تمہارے گھر پر کیا قیامت ٹوٹے گی اس کا تم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہو۔ میری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔ ہمیں حکم تو یہی ملا ہے کہ اختر کے دوستوں کو ایک ایک کر کے ”سرکاری مہمان خانے“ کی سیر کروائیں اور وہیں ان کی تفتیش کی جائے، لیکن مجھے تمہارے گھریلو حالات کی وجہ سے رحم آ رہا ہے۔ خدا کا شکر کرو کہ تمہاری تفتیش میرے ذمے لگی ہے۔ اگر کسی اور کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ اس طرح تمہارے ساتھ بات نہ کرتا..... اب تم اتنے بچے بھی نہیں ہو کہ میں تمہیں بتاؤں کہ پولیس والے کس زبان میں گفتگو کرتے ہیں..... تمہاری عمر کا میرا ایک بھائی ہے جو تمہاری ہی طرح طلباء سیاست میں پھنس کر مصیبت میں پڑ گیا ہے۔ میں خود ان حالات سے گزر چکا ہوں۔ اس لئے تمہیں صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ اگر میرے ساتھ تعاون کرو گے تو ہم دونوں فائدے میں رہیں گے ورنہ یاد رکھنا کہ اس معاملے میں ملک صاحب تو کیا ان کا باپ بھی تمہارے کام نہیں آسکے گا۔ ہم لوگ پولیس کی طرح کوئی ریٹ تو درج نہیں کرتے.....“

انسپکٹر اکرم نے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت سے اندازہ لگالیا تھا کہ شکار جال میں پھنس گیا ہے۔ اس نے ایک دفعہ تو بابر کو خوفزدہ کر دیا تھا۔

”آپ مجھ سے کیا جانتے ہیں.....؟“ بابر نے حلق میں تھوک نکلتے ہوئے کہا۔

خوف سے اس کا گلا بری طرح خشک ہو رہا تھا۔ یہ شخص تو اس کے تمام گھریلو حالات جانتا تھا۔ واقعی اگر اس کے والدین کو بھٹک بھی لگ جاتی کہ پولیس یا سی آئی ڈی اس کے پیچھے ہے تو جانے وہ بدنصیب کیا کر گزرتے۔ اپنے والدین اور گھریلو حالات کے پیش نظر تو اس نے کبھی سرگرمی سے پالیٹکس میں حصہ ہی نہیں لیا تھا۔ بس اختر کے ساتھ دوستی کی وجہ سے وہ اس تنظیم کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ ورنہ تو اس نے کبھی کوئی غلط کام کرنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اختر کے متعلق تم جو کچھ جانتے ہو صاف بتا دو..... سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اس کے ساتھ مل کر کوئی واردات بھی کی تھی؟“

انسپکٹر اکرم نے ہوا میں تیر چلایا جو عین نشانے پر لگا۔

”نہیں! نہیں! خدا کی قسم میں نے تو اس کے ساتھ مل کر کبھی کچھ نہیں کیا۔ وہ تو اور لڑکے ہوں گے۔ مجھے کچھ علم نہیں مجھے تو وہ.....“

”ہاں! ہاں! شاباش! سچ سچ بتا دو۔ بے فکر رہو۔ میں نے کہا ناں کہ تم میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہو اور میں تمہارے ساتھ نہ کوئی خود زیادتی کروں گا نہ کسی کو کرنے دوں گا لیکن شرط ایک ہے کہ تمہیں سچ بولنا ہوگا۔“ اکرم نے بے چینی سے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی۔ لڑکا کوئی کام کی بات بتانے جارہا تھا۔

”وہ تو جی مجھے کبھی پیسے دیا کرتا تھا اور کبھی کبھی مجھے عورتوں کے پاس لے جایا کرتا تھا۔“

”کہاں کس کے پاس؟“ اکرم نے بے قراری سے دریافت کیا۔

”تین چار عورتیں ہیں۔ ایک شاہی بازار میں گانے بجانے کا دھندہ بھی کرتی ہے۔ اس کے پاس تو وہ مجھے صرف ایک دفعہ لے گیا تھا۔ عورتوں کے ٹھکانوں کا مجھے علم نہیں لیکن ہم گلشن باغ کی ایک کوٹھی میں جایا کرتے تھے۔ وہیں سب کچھ ہوتا ہے۔“

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”دیکھو ایک بات ذہن نشین کر لینا۔ میں ابھی نرمی اور شرافت سے کام لے رہا ہوں۔ اگر تم نے مجھے ڈاج کرانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا.....“ انسپکٹر اکرم اپنا دباؤ اس پر مسلسل بڑھ رہا تھا۔

بابر کی گھگھی بندھ گئی تھی..... وہ بات بات پر قسم اٹھا کر اسے اپنے سچا ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔

”شاہی بازار والی عورت کا نام کیا ہے؟“

”مجھے نام کا تو علم نہیں ہے۔ میں اس کے کوٹھے تک..... آپ کو لے جاسکتا ہوں۔“

اس نے جواب دیا۔

”اچھا اب ذرا ذہن پر زور دے کر سوچو اور بتاؤ کہ اختر کہاں ہو سکتا ہے۔ پہلے یہ بتاؤ

کہ جو رپورٹ تھانے میں درج کروائی گئی ہے، کیا وہ سچ ہے؟“

”دیکھئے جناب آپ تو سی آئی ڈی والے ہیں۔ آپ سے کیا بات چھی ہے۔ اگر

انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے تو وہ میرا کیا شکر کریں گے“ آپ کو معلوم ہی ہے۔“

”بابر میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ تم میرے ساتھ اعتماد سے بات کر سکتے ہو۔ میں

تمہیں ملزم یا ملزموں کا ساتھی نہیں بلکہ اپنا بھائی سمجھ کر بات کر رہا ہوں۔“ اکرم نے بڑے برادرانہ

قسم کے لہجے میں اسے تسلی دی۔

”وہ مقدمہ غلط درج کروایا گیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اختر کو کسی نے اغوا نہیں

کیا۔ اختر کا تعلق تنظیم کے خاں گروپ سے تھا وہ لوگ عیاشی میں ہزاروں روپے لٹا دیا کرتے

تھے۔ آخر وہ پیسہ کہاں سے آتا تھا؟ میں نے ایک مرتبہ اختر سے پوچھا تو اس نے مجھے نشے کی

ترنگ میں بتا دیا تھا کہ وہ یہ سب پیسہ غلط طریقے سے حاصل کرتے ہیں..... جناب والا! وہ لوگ

مل کر ڈاکے مارا کرتے تھے۔ پٹرول پیسوں کو فلائنگ کوچوں کو لوٹا کرتے تھے اور ہر دفعہ بچ جاتے

تھے۔ خدا ہی جانے پولیس ان سے ڈرتی کیوں تھی۔ میرا یہ خیال ہے کہ ضرور اختر کسی ایسی ہی مہم

میں مارا گیا ہے۔ جاوید اختر آپس میں گہرے دوست تھے۔ عین ممکن ہے انہوں نے کہیں کوئی

واردات کی ہو اور وہ پولیس مقابلے میں مارے گئے ہوں..... لیکن اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ ان

کی لاشیں پھر کہاں گئیں۔ اخبارات میں بھی کوئی ایسی کہانی شائع نہیں ہوئی۔

”ہوں ںں.....“ اکرم نے لمبا سانس لینا..... ”تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ انہیں

اغوا نہیں کیا گیا۔“

”دیکھئے جناب! اسلامی تنظیم کا جنرل سیکرٹری میرا کلاس فیلو ہے۔ ہم نے سکول اور

کالج میں اکٹھے ہی تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ میرا محلے دار بھی ہے۔ ان لوگوں نے مقدمے میں اس کو

نازد کیا ہے۔ میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔“

”لیکن وہ بھی مسلح ہیں اور ان کے بھی خفیہ ٹھکانے ہیں۔“ اکرم نے اس کی آنکھوں

میں جھانکا۔

”میں اس سے انکار نہیں کر سکتا لیکن میرا دل کبھی نہیں مانے گا کہ انہوں نے ایسی گندی

حرکت کی ہو۔“

”تمہاری تنظیم کے تفتیشی مراکز کہاں کہاں ہیں؟“

اس سوال نے بابر کو پریشان کر دیا تھا جس کا اندازہ اکرم کو ہو گیا تھا۔ اس نے ایک

مرتبہ پھر اسے بڑے پیار سے برادرانہ انداز میں سمجھانا شروع کر دیا تھا کہ اس کے ساتھ ملاقات کی

خبر بھی کسی کو معلوم نہیں پڑے گی۔ اگر اس نے خود کسی کو بتا دیا تو الگ بات ہے۔

بہت سمجھانے بھگانے پر بھی بابر نے صرف دو ٹھکانے بتائے تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا

تھا کہ ان دونوں ٹھکانوں کا علم بھی اسے اختر کے ذریعے ہی ہوا تھا۔ اس نے اکرم کو یہ بھی بتا دیا تھا

کہ وہ لوگ مستقل تفتیشی مرکز قائم نہیں کرتے بلکہ انہیں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی ہوٹل

کے کمرے میں مخالف پرتشدد کر لیا، کبھی کسی گھر میں، کبھی کسی اور ٹھکانے پر۔“

”اب تم میرے ساتھ شاہی بازار چلو اور دور ہی سے اس جگہ کی نشاندہی کر دینا جہاں تم

اختر کے ساتھ آئے تھے۔ اس کے بعد تمہاری چھٹی..... کبھی بھول کر بھی اس ملاقات کا ذکر کسی سے

نہ کرنا۔ میں کوشش کروں گا کہ پولیس تک تمہارا نام نہ پہنچ سکے۔ کبھی کسی نئی بات کا علم ہو تو مجھے ضرور

خبر کرنا۔“ اس نے ایک فون نمبر بابر کو دیتے ہوئے کہا۔

بابر کو وہ اپنی موٹر سائیکل پر بازار تک لایا۔ موٹر سائیکل انہوں نے دور ہی کھڑی کر دی

تھی اور اب پیدل اس کو ٹھے کی طرف جا رہے تھے۔ کوٹھے کی سیڑھیوں کی نشاندہی کروانے کے

بعد اس نے ”ناں ناں“ کرنے کے باوجود انسپٹر اکرم اسے گھر کے نزدیک اتار کر گیا تھا۔ اس نے

واپسی پر ایک ہوٹل میں بابر کی اچھی خاصی مہارت کر کے اس کے دل و دماغ میں جگہ بنائی تھی۔

○

بابر سے الگ ہو کر وہ دوبارہ شاہی بازار آیا اور یہاں اپنے ایک پرانے ”سورس“ سے

اس نے متعلقہ کوٹھے کے متعلق معلومات حاصل کیں تو اس کے علم میں آیا کہ اس کوٹھے کی مالکہ مشہور طوائف مختاراں بائی ہے جس کی بیٹی نازنین آج کل بڑی اونچی ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ آفس میں رات دیر گئے تک وہ رپورٹ بناتا رہا۔ صبح اس نے آفس میں آتے ہی چوہدری غلام رسول کے سامنے ساری کارروائی بیان کر دی۔ چوہدری صاحب کی تو باجھیں کھل گئیں۔ انہوں نے بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی پیٹھ پر ہتھکی دی اور اسے آج رات مختاراں بائی کے کوٹھے کی نگرانی پر لگا دیا۔ انہیں امید تھی کہ اختر کے ساتھیوں میں سے اور بھی اس طرف آتے ہوں گے اور اس ابھی ہوئی ڈور کا کوئی نہ کوئی سراسر دوران کے ہاتھ لگے گا۔ چوہدری کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس نے آدھے سے زیادہ میدان تو مار لیا ہے۔ اب بس ایک آدھ کلو اوٹل جائے تو بیڑا پار۔



گھناؤ نے کھیل

ارسلان کو آج پہلی مرتبہ ملک صاحب نے خود نازنین کو لانے کی فرمائش کی تھی اور اب وہ ملک صاحب کی خواہش کے احترام میں ہی اس کے کوٹھے کی طرف جا رہا تھا۔ ابھی شام نہیں ڈھلی تھی۔ جب وہ نازنین کے دروازے پر موجود تھا۔ ارسلان کی شکل پر نظر پڑتے ہی مختاراں بیگم کے لعنتی چہرے پر رونق سی آ گئی۔ وہ اس طرح بے قراری سے اس کی طرف بڑھی جیسے ارسلان بہت مدت بعد اچانک اس طرف آ نکلا ہو۔ ”کہاں رہے بیٹا اتنے دن.....“ نازنین تو تمہارے بغیر اداس ہو جاتی ہے۔ کل سے ضد کر رہی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو تمہیں لے کر آؤں۔ اس روز کے بعد سے ایسے غائب ہوئے کہ کوئی خبر ہی نہیں۔“

”بی بی تمہارے لئے ہی کام کر رہا تھا۔ شکر کرو ملک صاحب قابو آ گئے۔ تمہیں کیا معلوم وہاں کیا کیا گل کھلائے جا رہے ہیں۔ وہ تمہاری رشتہ دار شریفان بائی ملک صاحب کے گھر جانے کہاں سے پہنچ گئی تھی۔ وہ تو شکر کرو ملک صاحب کو میری اجازت کے بغیر کوئی مل نہیں سکتا ورنہ شریفان نے تمہارا پتہ کٹوا دیا تھا۔ تمہیں تو علم ہے اس کی تینوں بیٹیوں کا۔ ایک تو آج کل پانچ چھ فلموں میں آ رہی ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر ہے..... میں نے بھی وہ سلوک کیا کہ کیا یاد کرے گی

نازنین اب تیار ہو رہی تھی اور مختار ان کے ساتھ دوسرے کمرے میں ارسلان موجود تھا۔ اس نے شریفاں کا پتہ مختار ان کے سامنے پھینک کر لوہا گرم کر دیا تھا۔ اب اس پر ایک ہی چوٹ لگانے کی ضرورت تھی۔

”میں سوچتا ہوں بی بی کہ آج شریفاں آئی ہے کل کوئی اور سالی نہ چلی آئے۔ ملک صاحب تو عیش طبیعت کے مالک ہیں۔ آخر میں کب تک ان بلاؤں کو روکتا رہوں گا۔ اس بیماری کا کوئی مستقل علاج ہو جائے تو کیا ہی بات ہے؟“

مختار ان اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی صوفے سے اٹھ کر اس کے قدموں میں آ بیٹھی تھی۔ وہ تو خود اس غم میں غلطاں تھی کہ شریفاں اگر کبھی براہ راست ملک صاحب سے ٹکرائی تو اس بازار میں بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔

شریفاں کی دولڑکیاں تو ابھی تک کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ وہ تو اور بھی بہت سے داؤ جانتی ہوں گی۔

”بیٹا! مولانا تجھے خوش رکھے جلدی سے بتا۔“ اس نے بے چینی سے کہا۔

”بی بی میرے پاس ایک بہت بڑی آفر ہے۔ اگر تم ذرا ہوشیاری سے کام لو تو ایک رات میں پانچ لاکھ روپے کی مالک بن جاؤ گی۔“

پانچ لاکھ کا ذکر سنتے ہی مختار ان کے چہرے کا رنگ تبدیل ہونے لگا تھا۔ اس کے منہ میں پانی بھرا آیا تھا اور وہ بار بار پوپلے منہ میں زبان پھیر رہی تھی۔

”میں حاضر ہوں بیٹا۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”پہلے غور سے سن لو۔ اگر میری بات کی سمجھ آ جائے تو ایڈوانس تمہیں کل پہنچ جائے گی۔

تم ان سیاسی لوگوں کو تو جانتی ہی ہو۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے یہ کیا کچھ کر گزرتے ہیں۔ ملک صاحب کی مخالف پارٹی کے ایک بڑے عہدیدار نے مجھے آفر کی ہے کہ اگر میں ملک صاحب کی کچھ خاص قسم کی تصویریں بنوادوں تو وہ ان تصویروں کا پانچ لاکھ روپیہ دینے کے لئے تیار ہے۔ مجھے کچھ زیادہ لاچ نہیں بس ایک لاکھ مجھے دے دینا باقی تمہارا۔ کسی کو کانوں کا خبر بھی نہیں ہوگی اور یہ نہ سمجھنا کہ وہ کوئی معمولی آدمی ہے۔ مرکزی حکومت کا وزیر ہے۔ اب نام اس کا کیا لوں۔ ملک صاحب جیسے تو اس کے دروازے کے باہر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ بی بی ذرا ہمت

سالی..... چوکیدار سے کہہ دیا کہ دھکے مار کر نکال دو اور آئندہ نظر آئے تو ٹانگیں توڑ دینا نیکہ کی۔“ اس نے مختار ان بائی پر پہلا حملہ ہی ایسا جان لیوا کیا کہ اسے ہاتھوں پیروں کی پڑ گئی۔

”ہائے ہائے یہ چھٹال کبخت وہاں بھی جامری..... اسے مولا اٹھائے۔ جانے کس برے وقت کی پیدائش ہے کبخت۔ اے بیٹا! سارا بازار اس کے کرکوت جانتا ہے۔ لعنت ہو اس اللہ ماری پر جانے یہ ”خانگی“ کہاں سے آن مری تھی ہمارے قبیلے میں۔“ مختار ان کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔

”تم گھبراؤ نہیں بی بی۔ میں جو ہوں وہاں۔ اگر قدم بھی رکھنے دیا تو ارسلان نام نہیں میرا۔ ایسی کئی دیکھی ہیں میں نے۔ بی بی تمہیں راز کی بات بتا دوں کہ اگلے الیکشن کے بعد ملک صاحب کو صوبے کی سب سے اہم وزارت ملنے والی ہے۔ سودا ہو چکا ہے بی بی..... ملک صاحب چاہیں تو اب بھی کوئی سی وزارت لے لیں، لیکن وہ تھوڑے عرصے کے لئے کچھ کرنا نہیں چاہتے..... الیکشن کے بعد دیکھنا۔ تمہارے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

اس کی بات سن کر مختار ان بی بی کے منہ سے رال نپکنے لگی تھی۔ وہ ارسلان پر صدمے سے ڈاری ہو رہی تھی۔

”آج ذرا نازنین کو تیار کر دینا۔ ملک صاحب کے منہ سے میں نے خود فرمائش کروائی ہے نازنین کی اور ہاں اسے سمجھا دینا کہ سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ خدمت میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہئے۔“

”باؤ ارسلان تو بے فکر ہو جا۔ ہماری طرف سے کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ بس تو ہمارا خیال رکھنا ہم تو تیرے نوکر ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ نازنین کے کمرے میں داو عیش دے رہا تھا۔

مختار ان بائی نے آج اپنی گرہ سے سارا خرچ اٹھایا تھا اور اس کے لئے خاص طور سے وہ سکی منگوائی تھی۔ رات گئے تک ماں بیٹی اس کی خاطر مدارت میں مصروف رہیں۔ مختار ان بائی نے سرشام ہی ”استادوں“ سے کہہ دیا تھا کہ آج کوٹھا نہیں بچے گا۔ آج بچی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ استاد بے چارے بچی کی جان کو رو تے صبر شکر کر کے واپس چلے گئے۔

مختار ان نے جاتے ہوئے تھوڑے تھوڑے پیسے ان کو خرچ کے لئے دے دیئے تھے۔

”تم فکر نہ کرو بی بی۔ جب تک میں موجود ہوں تمہارا کوئی بال بیکا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے طوائف کو مطمئن کرنے کے لئے اس کی بات درمیان ہی سے کاٹنے ہوئے کہا۔

”کام کب کرنا ہے؟“

”اگر تم چاہو تو آج ہی کر لیں..... لیکن میرے خیال سے آج مناسب نہیں، کیونکہ ابھی نازنین کو ہم نے مکمل اعتماد میں نہیں لیا اور اب وقت بھی رواں لگا رہا ہے۔ کچھ اور بندوبست بھی کرنا ہے..... لیکن تم مطمئن رہو میں چار پانچ روز بعد ہی ملک صاحب سے نازنین کی فرمائش کروادوں گا۔ بس اسے یہ سمجھا دینا کہ آج ذرا شکار کو اچھی طرح رام کرنے تاکہ اگلی مرتبہ اس پر چھری چلانے میں دقت پیش نہ آئے۔“

ارسلان کی اس بات پر دونوں مسکرا دیئے۔ دونوں اب بے ساختہ قہقہے لگا رہے تھے۔
تھوڑی دیر بعد نازنین اس کی گاڑی میں بنی ٹھنی ملک صاحب کی کونٹھی کی طرف جا رہی تھی۔

ارسلان کو اس بات کا علم نہ ہوسکا کہ انسپکٹر اکرم جس نے آج صبح ہی سے یہاں ڈیرے ڈال رکھے تھے اسے مختار راہبائی کے کونٹھے پر جاتے دیکھ چکا تھا اور پھر نازنین کے ساتھ کار میں بیٹھ کر جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ہنگامی صورت حال کے لئے بازار کے باہر سڑک پر کھڑی کار تک وہ موٹر سائیکل اڑاتا ہوا پہنچا تھا۔ اپنی موٹر سائیکل اس نے وہیں پھینکی اور اب وہ کار میں اونٹنٹے ڈرائیور کو بیدار کر کے سفید رنگ کی کار کے تعاقب کا حکم دے رہا تھا جس میں ارسلان اور نازنین محو سفر تھے۔

سفید کار جلد ہی انہیں بازار سے اس سڑک کی طرف آتی دکھائی دی۔ ڈرائیور اپنے فن میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اتنی مہارت سے تعاقب کیا کہ رنگ رلیوں میں مست کار چلاتے ارسلان اور نازنین کو احساس ہی نہ ہونے دیا۔

تعاقب کا خاتمہ ملک صاحب کی کونٹھی پر ہوا تو انسپکٹر اکرم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”وہ مارا.....!“ اس کے منہ سے نکلا۔

ڈرائیور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اکرم نے کھسیانی سی ہنسی ہنس کر اپنا منہ

کر لڑساری زندگی کی روٹیاں ہیں۔ عیش کرو گی عیش۔ وارے نیارے ہو جائیں گے تمہارے۔“

○

اس نے مختار راہبائی کی تمام دھتھی رگیں ایک ایک کر کے ایسی خوبصورتی سے دبائیں کہ وہ پھلی کی طرح اس کے جال میں پھنستی چلی گئی۔ مختار راہبائی نے ایسے ایسے پینترے دیئے کہ اس جیسی گھاگ کجری کے لئے فرار کی کوئی راہ ہی باقی نہ بچی۔

اس نے مختار راہبائی کو سمجھایا کہ ملک صاحب شراب کے نشے میں بالکل آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ اس کیفیت کا کچھ اندازہ مختار راہبائی کو بھی ملک صاحب کے ساتھ پہلی ہی ملاقات میں ہو گیا تھا۔ اس نے مختار راہبائی سے کہا تھا نازنین نے صرف اتنا کام کرنا ہے کہ ملک صاحب کو معمول سے کچھ زیادہ شراب پلا دے جس کے بعد ایک ماہر فوٹو گرافر اس چالاکی سے کام کرے گا کہ کسی کے فرشتے کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہو سکے گی۔ اس نے مختار راہبائی کو خاص طور سے کہا تھا کہ تصویروں میں نازنین اول تو نظر نہیں آئے گی۔ اگر کہیں نظر آ بھی گئی تو پوز ایسا ہوگا کہ جسے پہچانا مشکل ہو جائے گا۔

”اور بی بی تصویریں سب سے پہلے تمہارے پاس آئیں گی۔ اگر تمہیں کوئی شک ہو تو تم وہ تصویریں ضائع کر دینا جو پسند نہ ہوں..... جو تصویر تم چاہو وہی ہم اس شخص کو دیں گے..... اگر تم چاہو کہ تمہارا نازنین کا ملک صاحب کے مخالف لیڈر کو علم نہ ہو سکے تو ایسا ہی ہوگا۔ اگر تم ملنا چاہو تو تمہاری مرضی۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ ابھی ملاقات نہ کرو۔ پہلے رقم لے لیں۔ کوئی کونٹھی وغیرہ خرید لو۔ جب نئی حکومت بنے تو پھر ہم اس سے بھی کام نکلواتے رہیں گے۔“

مختار راہبائی کی ساری چالاکی ہوشیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ ارسلان کی چکنی چپڑی باتوں کی دلدل میں پھنستی چلی جا رہی تھی..... ارسلان نے اپنا کیس ایسی چالاکی سے پیش کیا تھا کہ طوائف کے لئے کوئی سوال کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑی۔

”ٹھیک ہے باؤ ارسلان لیکن پیسے کب ملیں گے؟“ اس کی رال بالا خرچک پڑی۔

”پہلے کچھ ایڈوانس مل جائے گا۔ اس کے بعد کامل ہونے پر باقی رقم۔“ اس نے

مختار راہبائی کے نزدیک منہ لے جا کر سرگوشی کی۔

”دیکھ لینا بیٹا کہیں.....“

وہ مختار ابا بانی کو لالچ و ہوس کے نئے جہاں کی سیر کرنا جب واپس پہنچا تو نجمہ بیگم بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

”اتنی دیر!“ اس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

”آپ کو خوشخبری سنانے جا رہا ہوں کہ آپ حیرت زدہ رہ جائیں گی۔“

اس نے نجمہ بیگم کے سامنے ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ ”مختار ابا بانی تیار ہے۔ وہ تو آج رات ہی تیار ہو گئی تھی لیکن میں نے سوچا ہنگامی طور پر کہیں کام ہی نہ بگڑ جائے۔ یوں بھی گرم گرم دودھ سے منہ جلانا ٹھیک نہیں۔“

”ویل ڈن.....!“ نجمہ بیگم نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے

دبایا۔

”شاباش! جیسے ہی یہ کام مکمل ہوا، میں بھی تمہیں ایسا سر پرانز دوں گی کہ خوش ہو جاؤ گے..... اچھا چلو ابھی سہی جب تم نے مجھے اتنی بڑی خوشخبری دے دی ہے تو میں تمہیں کیوں نہ دوں.....! ارسلان اس کام کے مکمل ہوتے ہی تم یورپ کا سفر بھی دورہ کرو گے۔“

ارسلان کو اس نے واقعی بڑی زبردستی خوشخبری سنائی تھی۔ اس نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ دنیا کے اس طلسم ہو شرابا کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ سکے گا۔

”تھینک یو۔“

”اور تمہارا پاسپورٹ بھی تیار ہو کر آ گیا ہے۔ وکیل صاحب صبح دفتر جاتے ہوئے دے گئے تھے۔“ اس نے نزدیکی میز پر رکھا اس کا پاسپورٹ ارسلان کو پکڑا دیا۔

اس پاسپورٹ کے اندراج کے مطابق وہ برنس مین تھا اور نجمہ بیگم نے اسے بتا دیا تھا کہ ایک انٹرنیشنل فرم جس کی ایک ڈائریکٹر وہ بھی ہے اور جس کے دفاتر نیویارک، لندن اور ایسٹرڈم میں قائم ہیں، وہ اس فرم کی پاکستانی شاخ کا منیجر تھا۔

”میں خواہ مخواہ جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتی، لیکن مغربی سفارت خانے ہمارے سچ کو قبول نہیں کرتے۔ انہیں ایسا سچ پسند ہے جو جھوٹ کے خوبصورت لبادے میں ملفوف کر کے ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ مثلاً اگر تم براہ راست امریکہ کی سیر کا ویزہ طلب کرو تو وہ لوگ تمہیں کبھی ویزا نہیں دیں گے حالانکہ تمہارے دماغ میں دور دور تک امریکہ میں غیر قانونی طور سے بس جانے

دوسری جانب پھیر لیا۔

”بس اب مجھے اپنی موٹر سائیکل لینی ہے اور تمہاری چھٹی۔“ اس نے ڈرائیور کو ہدایت

کی۔

○

ارسلان کی خدمات نے ملک صاحب کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا..... وہ عورتوں کے رسیا تھے اور زندگی بھر انہوں نے عورتوں کو کھلونا سمجھ کر ان سے دل بہلایا تھا، لیکن اس طوائف زادی نے ملک صاحب کو ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔ انہوں نے زندگی میں کبھی ایسی طرح دار عورت نہیں دیکھی تھی۔

نازنین کے ساتھ ساتھ انہوں نے ارسلان پر بھی انعام و اکرام کی بارش شروع کر دی تھی۔

صبح جب وہ نازنین کو سورج نکلنے سے پہلے اس کے کونٹے تک چھوڑ کر گیا تھا تو مختار ابا ان کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے زبردستی ارسلان کو وہاں ٹھہرا لیا اور دوپہر تک وہ بیہوش تان کر سوتا رہا۔

دوپہر کو اس کی آنکھ کھلی تو مختار ابا بانی..... نوکرانیوں کی طرح اس کے سر ہانے چائے لے کر کھڑی تھی۔ اس نے بوڑھی نائیکہ کو چاروں شانے چت کر دیا تھا اور وہ ارسلان کو پیروں کی طرح پوجنے لگی تھی۔

”بی بی! تمہاری قسمت کھلنے والی ہے۔ دونوں طرف سے راج کرو گی۔ ملک صاحب تو تمہارے غلام ہوں گے ہی مرکز والے بھی تمہارے قابو میں آ جائیں گے۔“

اس نے کوئی موقع ہاتھ سے نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”اے بیٹا! مولا تجھے خوش رکھے۔ بس یہ رقم مل جائے تو میں بھی بازار پر لعنت بھیج کر بیٹی کو کسی شریف آبادی میں لے کر بیٹھ جاؤں۔ ہم نے زیادہ لالچ کیا کرنا ہے۔ وہاں ہفتے میں ایک آدھ گاہک بھی آ جایا کرے تو کافی ہوگا۔“

”بی بی اس کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔“

○

”اکرم تم نے جو کچھ بھی کیا اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ اس کا پھل تمہیں اگلی دنیا میں نہیں اس دنیا میں ملے گا۔ میں چوہدری غلام رسول خدا کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارے لئے اپنی جان لڑا دوں گا، لیکن ایک وعدہ تم نے بھی مجھ سے کرتا ہے.....!“ چوہدری غلام رسول نے کہا۔

”حکم جناب!“

”جو کچھ ہم فائلوں کا پیٹ بھرنے کے لئے لکھ دیں گے آن دی ریکارڈ وہی کچھ ہوگا۔ اس کے علاوہ جو بھی ”آف دی ریکارڈ“ ہے وہ تمہارے اور میرے درمیان ایک راز ہے۔ میں تمہیں آج بتا رہا ہوں کہ اس معاملے میں دفاق کے کچھ لوگ دلچسپی لے رہے ہیں اور یہ ان کی خواہش ہے۔“

انسپکٹر اکرم کے لئے یہ کافی چونکا دینے والی یا سنسنی خیز خبر نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سرکاری ایجنسیاں سرکاری زیادہ اور ملک کی کم خادم ہیں۔ اگر کسی نے ایمانداری سے سروس رولز پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کی تو اسے تیسرے درجے کا کارندہ بننا پڑا۔ یہاں ترقی اور منصب کے دروازے صرف ان پر کھلتے ہیں جو حالات کے نبض شناس ہوں اور جنہیں ”خدمت کے فن“ میں کمال حاصل ہو۔ اس نے دیکھا تھا کہ یہاں آج کے ڈائریکٹری حکومت آنے پر مجرموں کی طرح تفتیش کاٹ رہے ہوتے ہیں اور بمشکل غیر ممالک میں جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

”جو حکم جناب.....!“ اس نے بڑی ہی اطاعت گزار لہجے میں کہا..... ”اگر جناب میری ”ابراڈ“ (غیر ملک) پوسٹنگ کے لئے سفارش کریں تو جناب میرے بچے بھی آپ کو دعائیں دیں گے۔“

”میں نے کہا ناں اکرم صاحب کہ میں اپنے وعدے کا پابند ہوں۔“

”مجھے بھی جناب حکم کا پابند ہی پائیں گے۔“

”ٹھیک ہے اب تم معمول کا کام کرو گے۔ اس کیس کو ختم ہی سمجھو۔ اگر مناسب ہو تو میں خود ہی تمہیں اگلی ہدایات دوں گا۔“

”اوکے سر!“ اس نے ایڑیاں بجائیں اور باہر آ گیا۔

کا کوئی منصوبہ نہ ہوگا اس کے برعکس اگر تم ان کی مرضی کی سچی جھوٹی دستاویزات ان کے سامنے پیش کر دو تو وہ بڑی خوشی سے تمہیں ویزہ دے دیں گے..... لیکن یہ مجبوری بھی ایک دوسرے ہی ہوتی ہے زیادہ دیر نہیں رہتی۔

اس لئے تمہاری موجودہ شناخت قائم کرنی پڑی..... ارسلان اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے تمام ممالک کی سیاست کو سمجھنے کے لئے ان ”ماسٹرز“ کو دیکھنا ضروری ہے جن کی یہ ممالک کٹھ پتلیاں ہیں۔ انسان کو وسعت نظر عطا ہوتی ہے۔ دل و دماغ میں کشادگی آتی ہے اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہماری بین الاقوامی دنیا میں کیا حیثیت ہے۔ میں تمہیں لاکھ بتاتی اور پڑھاتی رہوں کہ مغربی دنیا ایسی ہے ویسی ہے، لیکن جب تک تم اپنی آنکھوں سے سب کچھ نہ دیکھو، کچھ جان نہیں پاؤ گے۔ یوں بھی یاد رکھنا مشاہدے اور تجربے کے نعم البدل کچھ نہیں۔

پہلی مرتبہ میں جان بوجھ کر تمہیں اکیلے بھیج رہی ہوں، لیکن مطمئن رہنا تم وہاں خود کو اکیلا کبھی محسوس نہیں کرو گے۔ وہاں ہر جگہ تمہارے میزبان موجود ہیں۔ میں چاہتی ہوں تم میں خود اعتمادی آ جائے..... یوں بھی تم نو جوان ہو۔ ممکن ہے میری موجودگی میں کوئی شرم محسوس کرو۔ آئندہ سے ہم دونوں اکٹھے ہی سفر کیا کریں گے۔“ نجمہ بیگم نے اسے سب کچھ سمجھا دیا۔

اور.....!

اس نے نجمہ کی باتوں کو بچ جان لیا۔

اس نے آج ہی ارسلان کو دس پندرہ پاسپورٹ سائز تصاویر بنانے کی ہدایت کی تھی کیونکہ اس کے کچھ پیپرز اور شناختی کارڈز متعلقہ برنس سے متعلق تیار کرنے تھے۔ کچھ تصاویر یورپ میں اس کے میزبانوں تک پہنچانی تھیں۔ ارسلان تصاویر بنوانے چلا گیا۔

○

انسپکٹر اکرم نے جب کل رات کی کارگزاری پیش کی تو چوہدری غلام رسول کا جی چاہا کہ اٹھ کر اس کا منہ چوم لے۔ اس نے واقعی ایسا کارنامہ انجام دیا تھا کہ چوہدری صاحب نے جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اب وہ کم از کم اس پوزیشن میں آ گئے تھے کہ اس ”دفاقی شخصیت“ کو جس نے ان سے خصوصی رابطہ قائم کیا تھا ملاقات کر کے اپنی کارگزاری پیش کریں اور سرکار دربار سے انعام کے طلب گار ہوں۔

عزیزہ ہے۔ اس لئے موقع ملنے پر خود بھی داؤ لگا لیتا ہوں۔ پھر مفت کی مرغی کون چھوڑتا ہے جناب.....!“ اس نے چوہدری کو بظاہر اس انداز سے جواب دیا کہ اگر اس کے ذہن میں اس کے متعلق کوئی غلط خیال ہو تو وہ ختم ہو جائے۔

”اویار کس چکر میں پڑ گئے۔ بھیجی ہم نے کب منع کیا ہے۔ کرو موجیں۔ بس ہمیں تو اپنے کام سے مطلب ہے۔ اچھا تمہارا کیا خیال ہے یہ عورت اختر کے اچانک غائب ہو جانے پر کچھ روشنی ڈال سکے گی؟“

اس مرتبہ اس سوال نے پھر ارسلان کو چونکا کر رکھ دیا۔ اس نے سوچا اگر یہ لوگ پہلے ہی نازنین کے کوٹھے پر پہنچ گئے تو وہ شاید خوفزدہ ہو کر ملک صاحب کی تصاویر بنوانے سے انکار نہ کر دے۔ اس کے علاوہ اسے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ مختار ابا کو بھی اختر کے متعلق اتنا ہی علم تھا جتنا ارسلان کو۔ وہ بھی انٹیلی جنس والوں کو یہی کچھ بتاتی جو ارسلان بتا رہا تھا۔

”میرے خیال میں اس کے علاوہ تو اسے بھی کسی بات کا علم نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے بزنس کے حوالے سے ہی شاید کچھ بتا سکے..... یا یہ بھی ممکن ہے کہ اختر نے اسے اعتماد میں لیا ہو۔ بہر حال میں اس سلسلے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔“ اس نے گول مول سا جواب دیا۔

”ٹھیک ہے میرا بھی یہی خیال ہے۔ بہر حال تم ذرا اس نازنین کو کریدنا۔ شاید کوئی کام کی بات نکل ہی آئے۔“

”میری طرف سے تو آپ مطمئن ہو جائیں۔ ہم تو جناب آپ کے خادم ہیں۔ یاروں کے یار ہیں۔ جب آپ سے کہہ دیا کہ میری آپ کی دوستی چکی تو پھر کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔“

”تم اسے ذرا اٹھالو۔ اگر گھی سیدی انگلیوں سے نکل آئے تو ٹھیک ورنہ پھر ہم خود کچھ کریں گے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس بات کا آپ کو یقین دلا دوں کہ اگر وہ کچھ جانتی ہے تو مجھ سے چھپا نہیں سکتی۔ میں اب اسے کچھ کچھ جاننے لگا ہوں.....!“ ارسلان نے بے شرمی کی طرح ایک آنکھ دبائی۔

”ٹھیک ہے۔ اچھا ایک بات ہے۔ میرا خیال ہے تم بہتر مشورہ دے سکو گے۔ کیا ایسا تو

چوہدری غلام رسول نے آخری داؤ خود کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اب خود ارسلان سے ملنے جا رہا تھا۔ ابھی تک اکرم کو بھی اس نے علم نہیں ہونے دیا تھا کہ ارسلان سے اس کا براہ راست رابطہ ہے۔

دوسرے روز صبح ہی اس نے ارسلان کو فون کر کے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی اور اسے ملاقات کی جگہ بھی بتا دی تھی..... دوپہر تک دونوں وہیں پہنچ چکے تھے۔

چوہدری غلام رسول نے ساری زندگی پولیس سروس میں گزاری تھی، لیکن اس وقت وہ اپنا ”پولیسانہ“ انداز ایک طرف رکھ کر بڑی عاجزانہ گفتگو کر رہا تھا۔

”مختار ابا کی بیٹی کا ملک صاحب سے کیا تعلق ہے؟“ اس نے ادھر ادھر کی دوچار باتیں کرنے کے بعد براہ راست مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

اچانک سوال نے ایک لمحے کے لئے تو ارسلان کو گڑبڑا کر ہی رکھ دیا، لیکن اب وہ بڑا کامیاب اداکار بن چکا تھا اور اپنے چہرے کے تاثرات چھپائے رکھنے پر تو اسے کمال حاصل ہو گیا تھا۔

”ایک طوائف کا کسی سیاسی تماش بین سے کیا تعلق ہو سکتا ہے.....؟“

اس نے چوہدری کے سوال کا جواب بھی سوالیہ انداز میں دیا تھا۔

”تم تو وہاں آتے جاتے رہتے ہو۔“

”ہاں! پہلے کسی اور کی ڈیوٹی تھی اب میری ہے۔ جب ملک صاحب حکم دیں اسے جا

کر لے آتا ہوں۔ ان کی داشتہ ہے اور کیا.....!“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اختر کا جانا بھی یہاں رہتا ہے؟“ چوہدری نے یہ سوال اس کی طرف نکھکیوں سے

دیکھتے ہوئے کیا تھا۔

”چوہدری صاحب اختر کوئی بہت اچھا لڑکا نہیں۔ میں بہت معذرت سے عرض کر رہا

ہوں کہ وہ دلال قسم کا آدمی ہے۔ اس کا کام ملک صاحب کے لئے نئی سے نئی عورتوں کی تلاش اور

انہیں ملک صاحب کی خواب گاہ تک پہنچانا ہی تھا۔ جب سے وہ غائب ہوا ہے یہ ڈیوٹی بادل خواستہ

مجھے دینی پڑتی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں میں بھی کوئی ایسا سادھو سنت نہیں ہوں نہ ہی وہ میری کوئی

مضافاتی تھانے سے انہیں ڈاکے کی مکمل تفصیلات اور وہ گناہ ڈاکوؤں کی لاشوں کی رپورٹ مل گئی۔ مردہ لاشوں کی تصویریں اس نے ریکارڈ سے حاصل کر لی تھیں اور اب وہ ان کا موازنہ انخوا کنندگان کی تصویروں سے کر رہا تھا۔ یہ تصویریں بہت عرصے پہلے اٹلی جنس نے حاصل کر لی تھیں۔

چوہدری غلام رسول کو اس انکشاف نے بوکھلا کر رکھ دیا کہ مرنے والوں کی شکلیں ہو بہو ان دونوں سے ملتی تھیں۔ اتنی عظیم کامیابی کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ بدن پر لرزہ طاری تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے لائیخل کیس حل کئے تھے، لیکن یہ کامیابی اس کی تقدیر کا رخ موڑنے کے لئے کافی تھی۔

اب وہ بے قراری سے وفاقی شخصیت کی غیر ملکی دورے سے واپسی کا منتظر تھا جس کے سامنے اس نے اپنی کارکردگی بیان کرنی تھی۔ یہ وفاقی شخصیت ایک ہفتے کے غیر ملکی دورے پر گئی ہوئی تھی اور چوہدری غلام رسول اس کی واپسی کا منتظر تھا۔ وہ ایک ایک پل گن گن کر گزار رہا تھا۔

○

ملک نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ جب سے اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ اس مرتبہ صوبائی لیگ میں اس کے ”حاسد دھڑے“ نے اسے صوبائی کے بجائے صرف مرکزی اسمبلی کا ٹکٹ دلانے کی سازش شروع کر دی ہے تو اس کا ماتھا ٹھنکا..... اس نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ اگر اس مرتبہ بھی ملک صاحب منتخب ہو کر صوبائی اسمبلی میں آگئے اور یہاں صوبائی لیگ کی حکومت بن گئی تو نہ صرف وہ خود وزارت حاصل کر لیں گے بلکہ کم از کم دو اور اہم ترین پورٹ فولیو بھی اپنے گروپ کے لوگوں کو دلائیں گے۔ اس طرح صوبے کی سیاست پر عملدان کو مکناٹھ حاصل ہو جائے گی اور وزیر اعلیٰ بھی ان کا محتاج ہو کر رہ جائے گا۔

اس صورت حال کا علاج ان کے حاسدوں کے پاس یہی تھا کہ پارٹی کی مرکزی کمان کو ایسا چکر دیا جائے کہ وہ ملک صاحب کو صوبائی حلقے سے ٹکٹ ہی جاری نہ کریں۔

مخالفین کے اس گروپ کے اجلاس کی مکمل رپورٹ ملک کو مل چکی تھی اور وہ اس سازش کو چننے کا موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی اہمیت منوانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور آج کا اجلاس جو اس نے طلب کیا تھا وہ اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

ممکن نہیں کہ ملک نے انہیں مروا ڈالا ہو..... یا پھر وہ دونوں کہیں پولیس مقابلے میں مارے گئے ہوں کیونکہ ہمارے ایک سب آفس نے دو گناہ لاشوں کی رپورٹ درج کروائی تھی۔“

چوہدری نے آخری بات بالکل لاشعوری طور پر اور محض بات برائے بات کے انداز میں کہی تھی لیکن اس نے ارسلان کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھ لیا تھا پھر جلد ہی ارسلان نارمل ہو گیا۔

”کچھ بھی ممکن ہے جناب۔ کچھ بھی ممکن ہے۔ آپ اس آدمی کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ وہ دونوں اس کے انتہائی خاص آدمی تھے۔ مجھے تو ان کی موجودگی میں ملک صاحب نے کبھی زیادہ منہ لگانا پسند ہی نہیں کیا۔ یوں بھی ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ کسی نوجوان کو ملک کے نزدیک نہ پہنچنے دیں۔ شاید اس طرح وہ اپنے لئے کوئی خطرہ محسوس کر رہے تھے؟ یہ بھی ممکن ہے انہیں کسی دشمن نے مروا کر غائب کر دیا ہو۔ بندے تو وہ وارداتیا قسم کے تھے۔ چوری ڈاکو تو ان کے معمول تھے۔ ہمارا لڑائی جھگڑوں سے واسطہ رہتا ہے لیکن یہ مجرمانہ قسم کے کاموں سے میں تو کوسوں دور بھاگتا ہوں۔ جب اس کے بغیر ہی کام چل رہا ہے تو ضرورت کیا ہے کچھ کرنے کی؟“

چوہدری غلام رسول کا مقصد حل ہو گیا تھا.....!

اس نے وفاقی شخصیت کو پیش کرنے کے لئے مکمل کیس تیار کر لیا تھا۔

اب اس نے پچھلے دو تین ماہ میں نزدیکی پولیس اسٹیشنوں سے تمام لاوارث لاشوں کا ریکارڈ منگوانا تھا۔ اس کام میں اگر سے زیادہ اس کی مدد کون کر سکتا تھا۔ اکرم کے ذریعے اس نے آدھی جنگ جیتی تھی اور اب وہ آخری حملہ کرنے جا رہا تھا۔

یہاں سے رخصت ہو کر جب وہ دفتر پہنچا تو اکرم چھٹی لے کر جانے والا تھا، لیکن چوہدری صاحب نے اسے نئے احکامات سے آگاہ کر دیا۔ اس نے اپنے سیکشن کے تمام ملازمین کی ڈیوٹی اس کام پر لگا دی تھی۔ چوہدری صاحب نے اندازے سے گرد و نواح کے پندرہ بیس تھانے مارک کئے تھے۔ وہ چونکہ خود پولیس ڈیپارٹمنٹ سے آیا تھا۔ ایک ایڈوائس بھی اسے حاصل تھا کہ ان میں بہت سے تھانوں میں اس کے سابقہ ماتحت ہی انچارج لگے ہوئے تھے اور اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر وہ لن سے بہتر کام لے سکتا تھا۔

دو تین دن کی اس ایکسپریس سروس سے چوہدری صاحب کو گوہر مقصود ہاتھ لگ گیا اور ایک

وہ آج ہی اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔
اس سے پہلے کہ انٹیلی جنس مختار اس بات کی کوٹھے تک پہنچے۔ وہ اس کھیل کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔
نجمہ بیگم نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اپنے سیف کا تالا کھولا اور 50 ہزار روپیہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

”کیا خیال ہے اس سے مطمئن ہو جائے گی وہ؟“ اس نے ارسلان کی طرف دیکھا۔
”ہاں..... یہ معاملہ آپ مجھ پر چھوڑیں۔“
اس نے نوٹ اپنے کوٹ کی جیب میں محفوظ کر لئے۔
”فوٹو گرافی کے لئے کیا بندوبست کیا آپ نے؟“ اس نے نجمہ کی طرف دیکھا۔
”میں خود کروں گی۔“
”کک..... کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ میں خود تصویریں اتاروں گی اور اتنی صفائی سے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ تمہیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ کالج لائف میں فوٹو گرافی کا مقابلہ جیت چکی ہوں..... اور پھر اس کھیل میں ہم کسی تیسرے فریق کو داخل ہی کیوں کریں..... کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ ساری تصویریں ہمیں لوٹا دے گا۔“

کمال کی ہوشیار عورت تھی وہ..... ارسلان اسے دل ہی دل میں نجانے کتنی مرتبہ داد دے چکا تھا۔

”میں فریج میں شراب کے تیز نشے والی بوتل رکھ دوں گی۔ تم خود وہ بوتل نکال کر نازنین کو دینا۔ بے فکر رہو۔ وہ زہر نہیں ہوگا۔“ اس نے منصوبے کا اگلا حصہ بیان کیا۔
”یہ شخص معمولی زہر سے مرنے والے بھی نہیں نجمہ صاحبہ۔“ ارسلان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”شاباش.....! تم اپنے مشن پر چلے جاؤ۔ میں بعد میں اپنا کام شروع کرتی ہوں۔ میں اس طوائف کے سامنے نہیں آؤں گی۔ اسے علم ہی نہیں ہوگا کہ تصویریں کس نے اتاری ہیں۔ تم بھی اس معاملے میں خاموشی اختیار کرنا۔“

ارسلان اور اس کی تنظیم کے چار پانچ اہم ترین ممبرز اس وقت ملک صاحب کے ساتھ بڑی اہم میٹنگ کر رہے تھے۔

”کل سے جلوسوں کا آغاز کر دو اور یہ سلسلہ دونوں کی برآمدگی تک جاری رہنا چاہئے۔ آج اخبارات کو بیان جاری کر دو اور کل صبح نو بجے تمام لڑکوں کو مال روڈ پر جمع کر لو۔ یہ کبھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ کمال ہے میں اگر اتنے روز سے چپ ہوں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم بزدل ہو گئے ہیں۔ مجھ سے اب دونوں کے لواحقین کا دکھ دیکھا نہیں جاتا..... آخر کب تک انہیں جھوٹی تسلیاں دیتے رہیں۔ اگر سارے ملک کی سیکورٹی ایجنسیاں اور اس صوبے کی پولیس دو بے گناہوں کا اتہ پتہ نہیں لگا سکتی تو پھر جائے جہنم میں..... اب سنوڈنش خود ہی اپنے ساتھیوں کا پتہ لگا لیں گے..... ایک بات کان کھول کر سن لو۔ کل اپنی طاقت کا پورا پورا مظاہرہ کرنا..... پولیس کو دیکھ کر دم دبا کر بھاگنا نہیں، مقابلہ کرنا ہے مقابلہ..... ان کو اپنی طاقت کا احساس دلاؤ۔ یہ سالے طاقت کی زبان کے علاوہ اور کوئی زبان ہی نہیں سمجھتے اور ہاں میں تمہارے پیچھے..... دیوار کی طرح کھڑا ہوں، لیکن میرا نام کسی کی زبان پر نہیں آنا چاہئے۔ ایکشن کسی بھی وقت اتاؤنس ہو سکتا ہے اور پارٹی اس وقت کسی ایجنسی میں ہو سکتی، لیکن کیا کریں کل کو اگر ہماری حکومت نہ رہی تو ہم کہاں فریاد کریں گے..... جس حکومت کے دور میں یہ ظلم ہوا ہے۔ انصاف بھی وہی حکومت کرے گی..... شاباش تم اپنے اپنے مشن پر نکل جاؤ۔ لڑکوں کو راتوں رات ہوشیار کر دو۔ گرفتاری وغیرہ سے ہرگز نہ گھبرانا۔ راتوں رات تمہارے پلے کارڈز تیار ہو جانے چاہئیں۔“

اس نے لڑکوں کو ہدایات جاری کر کے رخصت کر دیا۔ ارسلان کو اس نے اپنے پاس ہی روک لیا تھا اور اب وہ اس سے مخاطب تھا۔

○

”یار بڑی ذہنی تھکاوٹ ہو رہی ہے..... کوئی بندوبست کر دھئی۔ اب اس بوڑھے کا خیال بھی تم نے ہی رکھنا ہے۔ وہ تمہاری بیگم صاحبہ کو تو اپنے سیاسی چکروں سے نجات ہی نہیں ملتی.....! ملک نے بڑی بے شری سے قہقہہ لگایا۔

جواب میں ارسلان نے بھی اس کا پورا پورا ساتھ دیا اور اب وہ یہاں سے سیدھا ”بیگم صاحبہ“ کے پاس جا رہا تھا۔

اتنی بھڑک جائے کہ پھر وہ ہوس کے ہاتھوں بالکل اندھے ہو کر رہ جائیں
”اور ایسا ہی ہوا.....!“

جب وہ نازنین کے ساتھ کوٹھی پہنچا تو ملک صاحب بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔
مسلل انتظار نے انہیں الجھن اور غصے میں مبتلا کر دیا تھا، لیکن نازنین کے سراپے پر نظر پڑتے ہی
ان کا غصہ ہوا ہو گیا تھا۔

”ذرا تیاری میں دیر ہو گئی تھی سرکار اور یوں بھی اندھیرے کا انتظار ضروری تھا۔ آپ
عزت دار لوگ ہیں۔ اجالے میں کسی نے مجھ دیکھ لیا ہوتا تو.....“ اس نے ملک صاحب کی بانہوں
میں بانہیں ڈال کر انہیں خوابگاہ کی طرف دھکیلا۔
ارسلان نے فریج سے بوتل نکال کر رکھ دی تھی اور نازنین اپنے کام میں مصروف ہو
گئی۔

”ملک صاحب میں ذرا ہوٹل تک جا رہا ہوں صبح کا بندوبست کرنے۔“ اس نے
کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
”نہیں..... لڑکے اپنا کام کر لیں گے۔ تم آرام کرو۔ صبح جلدی نازنین کو چھوڑ آنا۔“
انہوں نے ارسلان سے کہا۔

”ٹھیک ہے سر.....!“ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔
”باہر نکلتے وقت اس کی چھٹی حس نے کمرے کے بھاری بھر کم ریشمی پردے کے پیچھے
اسے سرسراہٹ کا احساس دلادیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ملک صاحب کے کمرے میں داخل ہونے سے
پہلے نجمہ بیگم نے یہاں مورچہ سنبھال لیا ہوگا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر وہ صوفے پر گر پڑا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔
اس نے یہ انتہائی خطرناک قدم اٹھا کر اپنی زندگی سے جو اٹھایا تھا۔ اگر ملک صاحب کو ذرا سا بھی
ہوش ہوا اور انہیں احساس ہو گیا کہ کوئی سازش کی گئی ہے تو وہ مختاراں اور نازنین کو ارسلان سمیت
اس طرح غائب کرواتا کہ بعد میں ان کا نام و نشان نہ ملتا.....!

اس کا دل خزاں کے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔
نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ دل ہی دل میں نجانے کتنی مرتبہ اس مرحلے

”ٹھیک ہے جیسا آپ فرمائیں.....!“ اس نے نجمہ بیگم سے کہا اور کمرے سے باہر
نکل آیا۔ اس کا رخ اب اپنے کمرے کی طرف تھا۔

اپنی مختلف جیبوں میں ٹھونسنے نوٹوں میں سے آدھے اس نے اپنی الماری میں رکھے۔
اسے تالا لگایا اور گاڑی میں بیٹھ کر مختاراں بائی کے کوٹھے کی طرف روانہ ہو گیا۔

مختاراں کی رال اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی ٹپکنے لگی۔ ارسلان اس کا ہاتھ پکڑ کر فوراً
دوسرے کمرے میں لے گیا..... اس کے ساتھ ہی اس نے پچیس ہزار روپے نکال کر اس کے
سامنے رکھ دیئے۔

نانیکہ نے اتنے روپے اکٹھے کب دیکھے تھے۔ ندیدے بچوں کی طرح لپک کر اس نے
روپے اٹھائے اور اپنی جھول میں رکھ لئے۔

”کتنے ہیں بیٹا.....؟“

”پچیس ہزار!“

”اتنے کم.....؟“

”ایڈوانس ہے بی بی اور ایک بات غور سے سن لینا۔ اب ہم نے ایڈوانس پکڑ لیا ہے۔
اب بھاگنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ ان لوگوں کی دوستی کے جتنے فائدے ہیں دشمنی کے
اتنے نقصانات۔ بی بی! یہ تو سونے کی مرغیاں ہیں۔ ایک ایک کر کے ان کے اثر سے کھالوگی تو
مزے میں رہیں گے۔ ایک ہی مرتبہ چھری پھیر کر اپنا ہی نقصان کریں گے۔ میں نے جان بوجھ کر
زیادہ ایڈوانس نہیں مانگا۔ کام ایسے کریں جیسے ہم احسان کر رہے ہیں ان پر تب ہی بات بنے
گی..... جتنے پیسے میں نے تمہارے لئے ایڈوانس حاصل کئے ہیں ان سے آدھے پیسوں میں
شریفان کی بیٹیاں سارا کام کرنے کو تیار ہو جائیں۔ بس چپ چاپ میری بات مانتی رہو تو وارے
نیارے ہو جائیں گے۔“ اس نے مختاراں بائی کی عقل پر پردہ ڈال دیا۔

”ٹھیک ہے بیٹا۔ جیسی تمہاری مرضی۔“ شاید مختاراں سمجھ گئی تھی کہ اب کوئی راستہ نہیں
بچا۔

اس نے نازنین کو سارے داؤ پیچ سکھا کر ارسلان کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ ارسلان جان
بوجھ کر رات دیر گئے یہاں سے روانہ ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس درمیان ملک صاحب کی آتش شوق

”کیا مطلب تمہاری عقل گھاس چرنے تو نہیں گئی..... کہیں تم نے بھی ملک صاحب کے ساتھ چڑھا تو نہیں لی؟“

ارسلان نے انجان بننے ہوئے کہا۔

جواب میں نازنین قسمیں کھانے لگی کہ اس نے ایک عورت کو پردے کے پیچھے سے تصویریں اتارتے دیکھا ہے۔ بمشکل ارسلان اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوا کہ وہ عورت نہیں مرد تھا۔ بال اس کے چونکہ بڑے بڑے تھے اس لئے شاید اس نے لڑکی سمجھ لیا ہو۔

”تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔ ویسے وہ تھی کوئی عورت۔“ نازنین نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”اچھا ابھی جو تم کہہ رہی ہو وہی سچ ہوگا۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟“ ارسلان نے زچ آنے کے انداز میں کہا۔

”آپ تو ناراض ہو گئے.....!“ نازنین نے بے ہودہ سی حرکت کرتے ہوئے کہا۔
نازنین کو وہ اس کے کوٹھے کی میز ہیوں تک چھوڑ کر واپس آ گیا۔ بازار کی رونقیں ماند پڑ چکی تھیں۔ دکاندار اپنی دکانیں بڑھا رہے تھے اور کسی دم بھی ایک منحوس صبح یہاں اترنے والی تھی۔ بازار میں کہیں کہیں گشت کرتے مقامی تھانے کے اکا دکا سپاہی تھے یا پھر کھانے کی دکانوں کے باہر تماشا بینوں کی چوڑی ہوئی ہڈیوں پر منہ مارتے خارش زدہ کتے..... اور کچھ بلیاں.....! واپس آ کر وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر ہی بے سدھ ہو کر گر پڑا۔

اسے ملک صاحب نے بازو جھنجھوڑ کر بیدار کیا تھا.....!

”سوری سر.....!“ اس نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

صبح کے آٹھ بجے رہے تھے۔

”کوئی بات نہیں یار۔ آج تو میری آنکھ بھی نہیں کھل رہی تھی۔ جانے اس سالی نے کیا

پلا دیا۔ ابھی تک دماغ گھوم رہا ہے۔ شاید میں کچھ زیادہ ہی پی گیا تھا۔“ ملک صاحب بولے۔

”سرا چیز ہی ایسی تھی۔“ اس نے بے شرموں کی طرح دانت نکالتے ہوئے کہا۔

جواب میں ملک نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

کے بخیر و خوبی گزر جانے کی دعا مانگ رہا تھا۔ نجمہ لاکھ چالاک ہو شیار سہی! لیکن یہ بھی تو ممکن ہے اس سے کوئی غلطی ہو جائے۔

اس اذیت ناک صورت حال سے بچنے کے لئے وی سی آر پر ایک بیہودہ فلم چلا دی تھی! لیکن اس فلم میں اس کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ دو گھنٹے تک اس نے اس کیفیت کا عذاب بھگتا۔ جب اچانک ہی اس نے بلی کی طرح دبے قدموں نجمہ بیگم کو اس طرف آتے دیکھا۔ کیمبرہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور اس کا چہرہ احساس فتح سے متمار ہوا تھا۔ ارسلان کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنی دو انگلیوں سے فتح کا نشان بنایا اور فتح کے نشے سے لڑکھڑاتی اس کے نزدیک پہنچ گئی۔ اس نے ارسلان کا ہاتھ مضبوطی سے دبا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ارسلان سہم کر رہ گیا۔

”تھینک یو ارسلان.....!“ اس کی آواز آج ارسلان کو معمول سے بالکل مختلف سنائی دے رہی تھی۔ ایک خمار سا اس پر طاری تھا۔

ارسلان نے اس کے ہاتھ میں دنیا کا جدید ترین کیمبرہ دیکھ لیا تھا۔ ایسا کیمبرہ جوش لائٹ کے بغیر بھی اندھیرے میں تصویریں اتار سکتا تھا جب کہ اندر تو اچھی خاصی روشنی تھی۔
”صبح ملاقات ہوگی.....!“

کہہ کر اس نے ارسلان کا ہاتھ چھوڑ دیا اور فتح کے نشے کی اسی کیفیت سے سرشار میز ہیوں کی طرف چل دی۔ میز ہیوں کے خاتمے پر اپنے کمرے کے دروازے پر رک کر اس نے ایک مرتبہ پھر ارسلان کی طرف گہری نظروں سے دیکھا اور ایک عجیب سا اشارہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ارسلان کو اپنے خون میں انگارے دہکتے محسوس ہونے لگے تھے۔ اس کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا۔ وہ خود کو ہلکا محسوس کر رہا تھا۔

رات ڈھل رہی تھی جب نازنین دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے صوفے پر اوٹگھٹے ہوئے ارسلان کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا اور اپنے ساتھ باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ارسلان نے اٹھ کر زوردار انگڑائی لی اور اس کے ساتھ کار کی چابی سنبھالتا باہر آ گیا۔

”کون تھی وہ؟ میں نے اسے دیکھا تھا۔ کوئی عورت تھی؟“ اس نے ارسلان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہی کہا۔

وہاں کوئی ایک مسئلہ تو نہیں تھا۔ مقامی انتظامیہ کو صورت حال کی سنگینی کا مکمل احساس تھا اور وہ جانتے تھے کہ کل کے اخبارات میں پولیس کی بہیمانہ کارروائی کی خبریں چھپیں گی تو عوام میں اس کا رد عمل کتنا شدید ہوگا۔

صوبائی سیاسی لیگ کے سیاستدان اپنی جگہ پریشان تھے کہ مرکزی پارٹی ”ایشو“ کو بنیاد بنا کر ان کے خلاف عوامی طوفان کھڑا کر دے گی اور ان کی ساکھ کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔

اس وقت صوبائی وزیر اعلیٰ کے ہاں ہنگامی اجلاس ہو رہا تھا جس میں کابینہ اور انتظامیہ کے اعلیٰ اراکین کے علاوہ پارٹی کے سینئر عہدے دار بھی موجود تھے لیکن ملک صاحب حاضر نہیں تھے.....!

جب سیکرٹری جنرل نے انہیں ہنگامی میٹنگ کی اطلاع دی تو انہوں نے خرابی صحت کا بہانہ بنا کر معذرت کر لی۔

ہر کوئی اپنا نقطہ نظر بیان کر رہا تھا لیکن نو جوان اور جہاندیدہ صوبائی سربراہ کچھ اور سوچ رہا تھا..... وہ جانتا تھا انقلابی طلباء تنظیم کی طنائیں کس کے ہاتھ میں ہیں اور کس کے اشارے پر یہ لوگ اتنے پھرے ہوئے ہیں۔

وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنی سیکرٹری کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

”ملک صاحب کے گھر جاتا ہے۔ ابھی اسی وقت.....!“ انہوں نے سیکرٹری سے کہا۔

”او کے سر۔“ سیکرٹری نے حفاظتی گارڈ کو مطلع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ملک صاحب کے گھر ان کی مزاج پر سی کر رہے تھے۔

”کیا بات ہے ملک صاحب نصیب دشمنان طبیعت کچھ خراب ہو گئی کیا؟“ وزیر اعلیٰ

نے بڑی ذومعنی سی بات کہہ دی تھی۔

”ہم تو کمزور بندے ہیں جناب۔ ذرا سا موسم بگڑا اور طبیعت خراب ہو گئی۔ ظاہر ہے

جناب سردی گرمی کا اثر تو ہوتا ہی ہے۔“ ملک نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

”ملک صاحب یہ لڑکوں کا کیا مسئلہ ہے؟ آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں یہ دن دیکھنا پڑ

رہا ہے۔“ انہوں نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

تیار ہو کر انہوں نے ناشتہ اکٹھے ہی کیا۔ اس کے بعد ارسلان طلباء کا جلوس منظم کرنے کی مہم پر نکل گیا۔ ملک صاحب نے اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ سامنے نہ آئے اور پیچھے ہی رہے۔ وہ اتنے کام کے نو جوان کو ایک لمحے کے لئے بھی خود سے الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ملک نے اپنے کمرے میں ٹیلی فون سنبھال لیا تھا۔ وہ اخبارات میں اپنے زر خرید صحافیوں کو اس جلوس کی شاندار کوریج کی ہدایات جاری کر رہا تھا اور جواب میں ”جی سر! میں سر! مطمئن رہے سر!.....! ملک صاحب خادم ہیں آپ کے۔“ جیسے جوابات سن رہا تھا۔

یہ جلوس اتنا اچانک اور بھرپور تھا کہ انتظامیہ چکرا کر رہ گئی۔ نو جوانوں نے پلک جھپکتے شہر کی معروف ترین شاہراہ پر چار سرکاری بسیں روک کر انہیں نذر آتش کر دیا۔ طلباء اتنے پھرے ہوئے تھے کہ جب ہنگامی پولیس کے دستے نہیں منتشر کرنے کے لئے پہنچے تو وہ پولیس سے ٹکرا گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے مال روڈ میدان جنگ کا منظر پیش کرنے لگی۔

○

ایک طرف تو نو جوان طلباء پولیس پر پتھراؤ کر رہے تھے اور دوسری طرف سے پولیس بھی نو جوان طلباء پر پتھر پھینک رہی تھی۔ آنسو گیس کے گولوں نے فضا مکدر کر دی تھی اور نزدیک دور کی آبادیوں میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

دو تین گھنٹے پولیس اور طلباء کا جم کر مقابلہ ہوا۔

اس دوران مختلف اخبارات کے صحافی اپنے پیشرہ ورائے فرائض جان بھیلی پر رکھ کر ادا کرتے رہے۔ دو تین فوٹو گرافروں کو بھی پولیس نے بری طرح پیٹ ڈالا اور ان کے کیمرے چھین کر فلمیں ضائع کر دیں۔ اس کے باوجود کچھ فوٹو گرافرز تصویریں بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

نیا آئی جی جو صوبائی سربراہ کا رشتہ دار بھی تھا اس صورت حال سے بوکھلا کر رہ گیا۔ وہ اب تک نجائے کتنی مرتبہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کو کوس چکا تھا جن کے ملازمین کی فوج ظفر موج شہر میں دندناتی پھرتی ہے اور جنہیں طلباء کے اس جلوس کی پیٹنگی خبر ہی نہ ہو سکی۔

بڑی مشکل سے طلباء کو منتشر کیا گیا۔ سرکاری املاک کی تباہی، زخمی طلباء اور پولیس والے

تشدد کا شکار صحافی اور رپورٹرز متاثرین راہ گیر اور ان کی گاڑیاں.....!!

کئے۔

جنرل سیکرٹری صاحب نے اس صورت حال کی زبردست مذمت کرتے ہوئے طلباء سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنی صفوں میں گھس آنے والی بھینٹوں کو نکال باہر پھینکیں۔ انہوں نے صوبے کی انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا اور زور دے کر کہا کہ طلباء کی ہمدردیاں صوبائی سیاسی لیگ کے ساتھ ہیں اور آئندہ الیکشن میں وہ صوبائی سیاسی لیگ کی الیکشن مہم چلائیں گے۔

○

چوہدری غلام رسول اس وقت ”مرکزی شخصیت“ کے سامنے موجود تھا۔ ان کی ملاقات اسی ریسٹ ہاؤس میں ہوئی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے تمام واقعات کی تفصیلات ثبوت کے ساتھ سامنے رکھ دیں۔

”ویل ڈن..... چوہدری صاحب کمال کر دیا آپ نے۔ دل خوش کر دیا۔ اب آپ دیکھیں ہم آپ سے کیسے دوستی نبھاتے ہیں۔“ مرکزی شخصیت کے وزیر نے تصاویر اور فائل اپنے بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔

”جناب آپ دیکھیں گے کہ میں دو چار روز کے اندر قاتلوں کو گرفتار کر کے قانون کے سامنے پیش کر دوں گا۔“ چوہدری صاحب نے ترنگ میں آ کر کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں.....!“ مرکزی وزیر کا لہجہ بڑا سرد اور بدلا بدلتا تھا۔

”میں سمجھا نہیں جناب۔ دو قتل ہوئے ہیں اور ملکی امن و امان کی حالت خطرے میں ہے..... آپ فرما رہے ہیں کہ ہم قاتلوں کو گرفتار نہ کریں۔“ چوہدری نے جانے یہ سب کچھ کیسے کہہ گیا۔

”چوہدری صاحب! آپ صرف اتنا کہتے جتنا آپ سے کہا گیا۔ اسی طرح ہماری دوستی قائم رہ سکتی ہے۔ اس کیس کی فائل بند ہو جانی چاہئے۔ آپ نے جتنا قاتلوں کا پیٹ بھر دیا کافی ہے..... اگر آپ نے زیادہ ہی وفاداری دکھائی تو پھر مجھے افسوس سے کہنا پڑے گا کہ آپ اکیلے رہ جائیں گے۔“

چوہدری غلام رسول کو زندگی میں پہلی مرتبہ کسی وزیر پر غصہ آیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

”جناب! میری کیا حیثیت ہے۔ آپ کے منہ چڑھے لوگ جو میرے خلاف مینٹگیں بلاتے پھرتے ہیں وہی جانتے ہوں گے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ واقعی یہ خبر وزیر اعلیٰ کے لئے نئی تھی۔

”جناب والا! ہم تو سیاسی بندے ہیں۔ اپنی آنکھیں اور کان کھلے نہ رکھیں تو ہمیں کوئی جینے نہیں دے گا۔ آپ کو یہ لوگ اپنا دوسرا چہرہ دکھاتے ہیں ان کا اصلی چہرہ میں نے دیکھا ہے۔ جناب والا! اگر بھنڈر جیسے لوگ ہمارے لئے ٹکٹوں کا فیصلہ کریں گے تو پھر ہم نے تو ساری زندگی جھک ہی ماری..... ہم تو سیاستدان نہ ہوئے۔ ہماری حیثیت تو پھر مٹیوں والی ہو گئی ناں۔“ ملک جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔

مدبر نوجوان اور حالات پر نظر رکھنے والے وزیر اعلیٰ کو ساری بات سمجھ آ گئی تھی۔

”ملک صاحب میرے ہوتے ہوئے آپ کی طرف کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا..... کس کی مجال ہے جو ہمارے ہوتے ہوئے آپ کے خلاف سازش کرے گا۔“

”ٹھیک ہے جناب جیسا آپ کا حکم۔ یہ لڑکے سر پھرے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمیں بھی ڈرانے دھمکانے لگتے ہیں۔ غلطی میری ہی تھی ذرا ہاتھ تنگ ہے آج کل۔ خرچ پانی تھوڑا کم دے رہا ہوں خیر کچھ کرتے ہیں۔“ ملک نے ایک اور پتہ پھینک دیا۔

”اس کی آپ پروا نہ کریں۔ ہمیں صوبے میں امن و امان چاہئے۔ خواہ اس کی کچھ ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔“

ملک صاحب کو وزیر اعلیٰ صاحب اپنے ساتھ مینٹنگ میں واپس لے آئے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہاں انتہائی طلباء تنظیم کے لیڈر جمع ہو چکے تھے۔

انتظامیہ سے مینٹنگ کے بعد انہوں نے اپنی تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں انتظامیہ نے تمام گرفتار شدہ طلباء کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ تنظیم کے جنرل سیکرٹری ارسلان کی طرف سے اخبارات کو جو بیان جاری کیا گیا اس میں کہا گیا تھا کہ انہوں نے پرامن جلوس نکالا اور جس کا مقصد صرف اپنے ساتھیوں کی بازیابی کا مطالبہ کرنا تھا۔ مخالف تنظیم کے کارکن بھی بدل کر اس جلوس میں شامل ہو گئے جنہوں نے ساری توڑ پھوڑ کی اور پولیس پر حملے بھی

دوستی کے نام پر

آج جب اچانک اس نے کانٹا کوفون کیا تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ فون پر تو وہ بھی محسوس کر رہا تھا۔ حقیقت کیا تھی اس کا علم اسے نہیں تھا۔

”کہاں غائب ہو گئے تھے آپ؟ فون اٹھایا ہی نہیں۔“ اس نے چھٹے ہی پوچھا۔

”بس میں نے یہی اطلاع دینے کے لئے فون کیا ہے میں نے فلیٹ بدل لیا۔“ اس نے نیا نمبر لکھاتے ہوئے کہا۔ شمشا جی کیسی ہیں؟“

”ایک دم شاندار..... وہ بھی آپ کے اچانک غائب ہونے پر پریشان ہیں۔“ اس نے فون شمشا کو پکڑا دیا۔

شمشا نے روایتی انداز سے اس کے نہ ملنے کا گلہ کیا اور ارسلان نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ڈالی۔ ”ذرا علیحدگی میں باتیں کر لیں گے“

دیئے تو موقع نہیں ملتا۔ پھر آپ بھی تو دو تین روز بعد واپس چلی جائیں گی۔“ اس نے کہا۔

”اوہ ضرور! کیوں نہیں۔ کب آ رہے ہیں آپ؟“ شمشا جیسے اس کی دعوت ہی کی منتظر تھی۔

”آج بلکہ ابھی.....! بس ایک گھنٹہ میں پہنچتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

صرف سوچ سکتا تھا۔

غصے سے پاؤں پٹختا وہ چپ چاپ وزیر صاحب کو سلام کر کے باہر آ گیا۔ وزیر نے بچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ بھی خطرے کی بومیلوں سے سو گھنٹے والا سیاسی گرگ جہاندیدہ تھا۔

اگلی صبح جب چوہدری غلام رسول اپنے آفس پہنچا تو اس کو ایک سرکاری حکم نامہ تھا دیا گیا۔

چوہدری صاحب کی تبدیلی یہاں سے پانچ سو میل دور اسی عہدے پر ایک اور ضلع کی پولیس لائن میں کردی گئی تھی.....!

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سرکاری حکم نامہ گھورتے رہے۔ پھر بے دم ہو کر کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔



اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو آپ بھی میری طرح یقیناً اپنے ملک کے نوجوانوں کی بہتری اور تباہی کا مستقبل کے خواہاں ہوں گے.....!“ اس نے آج پہلی مرتبہ اس نوعیت کی باتیں کی تھیں۔

”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں!“ ارسلان نے چائے کا گھونٹ حلق میں اٹھیلے ہوئے کہا۔
”میں کہتی ہوں کہ آخر ہم جو ہندوستان کے نوجوان ہیں۔ ابھی تک اپنے بزرگوں کے درٹے کو کیوں جان سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ارسلان صاحب! ہمارے بزرگوں نے ہمیں نفرت کینہ، بغض اور ایک طویل تھکادینے والی سر دجنگ کے سوا دیا کیا ہے؟

میرے خیال سے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم تیسری دنیا کے نوجوان اپنی سوچ کو آزاد کر دیں۔ خود کو اپنے ملک کی سرحدوں میں پابند کر کے آخر ہم کب تک اندھوں کی طرح ترقی کا راستہ ٹٹولتے رہیں گے..... مسٹر ارسلان! کیا آپ چاہیں گے کہ جیسی بھیا تک زندگی ہمیں اپنے بزرگوں کی طرف سے بسر کرنے کو ملی ہے ہمارے بعد آنے والی نسل بھی ویسی ہی اذیت ناک زندگی گزارے؟

کیا مغربی دنیا کی طرح ہمیں ترقی کرنے اور زندگی کی چاروں اطراف بکھری خوشیاں سمیٹنے کا حق نہیں.....!“ ارسلان کو اندازہ ہو رہا تھا کہ رضوی صاحب نے ششما کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ اس سے بھی آگے کی کوئی چیز ہے۔

”کیوں نہیں مس! کیوں نہیں۔ برصغیر کا ہر نوجوان کم از کم اس سہانے مستقبل کی خواہش لے کر توجی رہا ہے.....!“ اس نے اپنے مزید قریب آتی ششما کے قرب سے اٹھتی ہوئی خوشبوؤں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

”پھر یاد رکھو۔ ہمیں یہ مذہب کی دیواریں گرانے ہوں گی۔ ہمیں اپنی سوچ سیکولر بنانا ہو گی۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھنا ہو گا۔ تب ہی ہم بیماری، غربت، افلاس اور اپنی بے کسی کا خاتمہ کر سکتے ہیں..... مسٹر ارسلان یہ سفر مل کر ہی طے ہو سکتا ہے..... مل کر ہی.....!“

”ہاں ششما تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... لیکن کس طرح؟ ہماری راہ میں کتنے ضابطے کتنی رکاوٹیں حائل ہیں۔ اس کا اندازہ ہے تمہیں؟“

ارسلان نے رضوی صاحب کی تربیت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

”ویل ڈن.....!“ اس کے فون رکھتے ہی رضوی بولا۔

اس نے فون رضوی کی موجودگی ہی میں کیا تھا۔ یہ شخص اسے کچھ الگ سا لگا تھا۔ آدمیوں کی اس بھڑ میں کسی محبت وطن کی موجودگی کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”اب یہ بھی بتادیں کہ مجھے کرنا کیا ہوگا؟“ اس نے رضوی سے دریافت کیا۔

”ارسلان صاحب! یہ کافی ہوشیار لڑکی ہے اور لندن میں بھارتی سفارت خانے میں موجود ”را“ کے کنیٹ سے وابستہ ہے۔ کسی بھی طرح اس سے دوستی کر لو..... اگر ذرا ”پکی دوستی“ ہو جائے تو ویل اینڈ گلد.....!“ اس نے آنکھ دباتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

”رضوی صاحب! اگر اس دوستی سے ملکی خدمت میں میرا بھی کچھ حصہ پڑ سکتا ہے تو میں حاضر ہوں۔ آپ مطمئن رہئے۔ آج اسے اس فلیٹ پر ضرور لے آؤں گا۔“
”شکریہ دوست! یہاں اپنے خانا ماں کے روپ میں تم مجھے موجود پاؤ گے۔“ رضوی نے کہا۔

”یہ کچھ مناسب نہیں لگتا.....!“ ارسلان شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔
”ارے بھائی! یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ہمیں تو بسا اوقات آدمی سے گلہ جانا پڑتا ہے۔ پروا نہ کرو..... بس ذرا نا مل رکھنا خود کو۔ خصوصاً مجھ سے بات کرتے ہوئے مجھے اپنا خانا ماں ہی سمجھ کر مخاطب کرنا۔ لڑکی ہوشیار ہے۔ ذرا چوک گئے تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔“
”بے فکر رہئے۔ مجھے خانا ماموں سے نمٹنے کا تجربہ حاصل ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کار پر کانتا کے گھر جا رہا تھا۔

آج مقامی چھٹی تھی اور کانتا گھر پر ہی اس کی منتظر تھی۔ دونوں نے اس کا جی جان سے استقبال کیا۔ اس کی تواضع ایک مرتبہ پھر بیڑ سے کی گئی۔ اس مرتبہ کانتا جان بوجھ کر ششما کو گفتگو کا موقع دے رہی تھی۔ اب تک وہ بہانے بہانے سے دوسرے دس پندرہ منٹ کے لئے غائب ہو چکی تھی۔ اس مرتبہ پھر وہ کسی کام کے بہانے اٹھ کر گئی تو ششما اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے نزدیک آن بیٹھی۔

”ارسلان صاحب! ہمارے درمیان دوستی کی ایک اہم وجہ ہمارا مشترکہ مشن بھی ہے۔

”مجھے سب مجبوریوں کا احساس ہے ارسلان۔“ اس نے اچانک ہی ارسلان کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔۔۔۔۔ ”آؤ ہم دونوں مل کر اس مشن کا آغاز کریں۔“

”میں تیار ہوں مس شمشا!“ ارسلان نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ شمشا نے اس کا ہاتھ اتنی گرجوٹی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا تھا کہ ارسلان کو اپنے خون کا خمیر بدلتا محسوس ہوا۔۔۔۔۔!

”میں رابطہ رکھوں گی۔ تم بھی مجھ سے رابطہ رکھنا۔ جلد ہی اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل تیار کریں گے۔۔۔۔۔ اگر کبھی تم لندن آنا چاہو تو میں حاضر ہوں۔ ہم نے وہاں تیسری دنیا کے نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کر رکھی ہے۔ اس کی طرف سے تمہیں کسی بھی وقت بلائے کا اختیار مجھے حاصل ہے۔“ اس نے ارسلان کے سامنے دانہ پھینکا۔۔۔۔۔!!

ارسلان نے بظاہر بے وقوف مرغی کی طرح دانا چک لیا۔

”ہاں! ضرور کچھ فرصت یہاں سے ملے تو آؤں گا۔ جب ہم کام کا آغاز مل کر کریں گے تو پھر ملتے ہی رہیں گے۔۔۔۔۔!“ اس مرتبہ بے تکلفی کا مظاہرہ ارسلان نے کیا تھا۔

اور۔۔۔۔۔!

شمشا نے اس بے تکلفی کا جواب اس کی توقع سے بڑھ کر دیا۔

کانٹا اندر آگئی تھی!

تینوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر شمشا کے اشارے پر اس نے ایک فوری مصروفیت کا بہانہ گھڑ لیا اور کانٹا ارسلان کے ساتھ۔۔۔۔۔ اس کی دعوت میں شریک نہ ہونے پر اظہار افسوس کرنے لگی۔ ارسلان کی خواہش کے عین مطابق سب کچھ ہو رہا تھا۔

دونوں صیاد ایک دوسرے کو شکار کرنے جا رہے تھے۔

کانٹا انہیں ایک ”خوبصورت دن“ کی دعا دے کر چلی گئی اور شمشا ارسلان کی کار میں اس کے فلیٹ کی طرف چل دی۔ اس مرتبہ تعاقب کرنے والے خاصے ہوشیار تھے، کیونکہ آدھ گھنٹے کے اس سفر میں شمشا بار بار کار کے اندر دنی شمشے میں جھانکنے کے باوجود اندازہ نہ کر پائی کہ ان کا تعاقب کوئی کر رہا ہے۔

گھنٹی بجانے پر دروازہ ”خانساں“ نے کھولا تھا۔۔۔۔۔!

ارسلان کے ساتھ شمشا بھٹہ چاریہ کو دیکھ کر رضوی صاحب کے دل کی دھڑکن ایک مرتبہ تو ابنا مل ہو گئی۔

”سورس!“ اس کی توقع سے بڑھ کر ”کارآمد“ ثابت ہو رہا تھا۔۔۔۔۔!!

”چڑیا بالا خرہ پنجرے میں پھنس ہی گئی۔۔۔۔۔!“ ایک مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

فلیٹ کے آرام دہ سنگ روم میں ایک صوفے پر ارسلان کے پہلو میں دھنسی شمشا بھٹہ چاریہ جود ہی دل میں ”شکار“ پھانسنے پر پھولے نہیں سار ہی تھی اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ وہ خود ”شکار“ ہو رہی ہے۔ اس کی پشت پر نصب حساب آلات ان کی گفتگو ریکارڈ کر رہے تھے۔

یہاں اس نے پھر ارسلان کے سامنے امن، شانتی، بھائی چارہ، بین الاقوامیت کا سنہری جال پھیلایا اور ارسلان طے شدہ منصوبے کے مطابق اس میں پھنستا چلا گیا۔ اس نے شمشا کی توقعات سے بڑھ کر اپنے جاہل ہونے کا ثبوت دیا تھا۔۔۔۔۔!

شمشا نے آہستہ آہستہ پاکستانی سیاست، فوج اور دینی جماعتوں پر تنقید کرنا شروع کر دی تھی اور وہ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔۔۔۔۔!

خانساں اس دوران دو مرتبہ ان کے سامنے ٹھنڈا اور گرم رکھنے کے بعد ان کے حکم پر کھانا تیار کر رہا تھا۔

”اگر آپ نوجوان لوگ چاہیں تو پاکستان میں سبز انقلاب لاسکتے ہیں۔ میں کہتی ہوں۔ ہم دونوں ممالک یورپ کی منڈیاں کیوں بنیں۔ ہم کیوں نہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تجارت کریں۔۔۔۔۔ ہم سے زیادہ ایک دوسرے کے دکھ کون سمجھتا ہے۔“

شمشا نے جب دیکھا کہ شکار قابو آچکا ہے تو اس پر آخری داؤ بھی آزمایا۔۔۔۔۔!

”یہی میں چاہتا ہوں شمشا جی!“ ارسلان کے منہ سے جیسے ہی یہ بات نکلی، شمشا نے بے اختیار اس پر امنڈتے ہوئے اسے ”خران تحسین“ پیش کر دیا۔

جائے گی..... بھی آخر جمہوری اور غیر جمہوری ممالک میں اتنا فرق تو ہونا چاہئے ناں۔ پھر میں تمہارے دشمن ملک کی لڑکی.....! اس نے ہنستے ہوئے بے ہودہ حرکت کی۔

”میں کسی کی پروا نہیں کرتا شمشا جی۔ میں کسی سے ڈرنے والا نہیں۔ میرا بھی طلباء سیاست میں ایک مقام ہے۔ ہر کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ میرے منہ لگتا پھرے۔ انٹیلی جنس.....“

”ارے نہیں.....!“ شمشا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا..... ”ایسا کبھی بھول کر بھی نہ سوچنا..... ان لوگوں سے بہت ہوشیار رہنا ارسلان! بھگوان نہ کرے تم کبھی ان کے شکنجے میں پھنسو..... ہمارے مشن کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان سے بچ کر رہا جائے..... کام زیادہ ضروری ہے۔“ اس نے ارسلان سے لپٹتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی گاڑی میں شمشا بھٹے چار یہ کو چھوڑنے جا رہا تھا۔ اس درمیان اس نے لندن کے اپنے خصوصی ٹیلی فون نمبر ایڈریس اور بہت سی دوسری باتیں اسے بتادی تھیں۔

ارسلان بچہ نہیں تھا۔

وہ جانتا تھا ان کی گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے اور تمام اطلاعات ان کے دوستوں تک منتقل ہو چکی ہیں۔ شمشا نے اس سے اب تک نجائی کتنی مرتبہ لندن میں ملنے کا وعدہ لیا تھا۔

اس نے کہا تھا ”کام“ کے سلسلے میں وہ خود رابطہ کرے گی.....!

ابھی تک نجمہ بیگم نے اس سے نازنین والا کارنامہ مکمل ہونے کے بعد اس مسئلے پر بات نہیں کی تھی۔

اس نے خود اظہار تحس نہیں کیا تھا۔ بس اگلے روز جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو نجمہ نے اسے ”آپریشن“ کا میاب ہونے پر مبارکباد ضرور دی تھی اور اس کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔

فی الوقت اس نے نازنین کے ہاں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، کیونکہ ملک صاحب بھی آج کل سیاسی معاملات سلجھانے کے سلسلے میں دارالحکومت گئے ہوئے تھے جہاں پارٹی کا مرکزی کونسل کا اجلاس چل رہا تھا جس کے وہ ایک سرگرم رکن تھے۔

آج ارسلان کو گئے پانچواں دن تھا۔

مختار اس باقی نے یہ دن ایک ایک لمحہ گن کر بسر کئے تھے۔ دوسرے اس نے ملک صاحب

اس ”خراج“ کا وقفہ پھر طویل ہوتا گیا۔

دونوں بظاہر یہی تاثر ایک دوسرے کو دے رہے تھے جیسے دونوں نے یہ حرکت جوش جوانی میں کر ڈالی ہے۔

ہوش مند خانساں نے انہیں مصروف دیکھ کر دروازے کے نزدیک پھٹکنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

خاصی دیر بعد جب دونوں نے خود کو سنبھال لیا تو ارسلان مسکراتے ہوئے اٹھا اور خانساں کو آواز دے کر بلایا۔

”بھی کب کھانا لارہے ہو.....؟ ابھی اور کتنی ورزش کراؤ گے ہماری؟“

خانساں نے مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”میں کھانا دوسرے کمرے میں لگا رہا ہوں صاحب!“ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

تیسری دنیا کے نوجوانوں کے مسائل حل کرنے اور آنے والی نسلوں کو محفوظ مستقبل دینے کے لئے شمشا بھٹے چار یہ نے ارسلان کے ساتھ مل کر جس مہم کا ارادہ کیا تھا۔ اس کا آغاز ہی اتنا بھرپور تھا کہ ارسلان کو اپنے جسم کا انگ انگ کھانے کی میز پر ٹوٹا محسوس ہوا۔

اپنی دانست میں شمشا نے اس ”دوستی“ کی بڑی مضبوط بنیاد رکھی تھی اور ارسلان سوچ رہا تھا کہ غیر ملکی سفارت خانوں کی یہ محترم ہستیاں جانے ایسی کتنی ”دوستی“ کی گہری بنیادیں پاکستان میں قائم کر چکی ہیں؟

اسے اب سمجھ آنے لگی تھی کہ اس بد قسمت ملک میں غداروں اور وطن فروشوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ کیوں ہو رہا ہے.....؟

کھانا کھاتے ہوئے شمشا نے اسے یہ خوشخبری بھی سنا دی تھی کہ لندن میں اس کا اپنا الگ فلیٹ ہے جہاں کسی ”مداخلت“ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ارسلان نے اسے جلد ملاقات کا یقین دلایا تھا..... شام ڈھلے جب شمشا نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو ارسلان نے کہا..... ”جی نہیں“ جہاں کہ تمہیں جانے دوں..... لیکن مجبوری ہے۔ تمہاری اپنی مصروفیات بھی تو ہوں گی۔“

”ارے نہیں! میری کوئی مصروفیات نہیں لیکن میں رات یہاں ٹھہر گئی ناں تو قیامت آ

وہ رات مختاراں بائی نے کانٹوں پر بسر کی۔ وہ کسی بھی قیمت پر شریفان کا منہ نوچ لینا چاہتی تھی۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ شریفان کو تھانے کا منہ ضرور دکھائے گی۔ مقامی تھانے میں تھنیدار سے اس کی ”یاد اللہ“ تھی اور وہ جانتا تھا کہ مختاراں بائی کے ملک صاحب سے خصوصی تعلقات بھی ہیں۔

مختاراں بائی تو خود شریفان کی خبر لینا چاہتی تھی، لیکن اس کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ اس نے کبھی غصے کو عقل پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر بازار کے لوگوں کو علم ہوا کہ اس نے شریفان کی شکایت کر کے اسے تھانے بلوایا ہے تو سارا بازار اس کا بائیکاٹ کر دے گا۔ وہ ٹھنڈے پیٹوں بھی بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن..... سیاست سے کام لینا ہی دانش مندی کا تقاضا تھا۔

اس نے معاملات کو کل پر چھوڑا اور سر ہانے تلے بازو رکھ کر لیٹ رہی.....!

○

دوسرے روز صبح ہی وہ تھانے چلی گئی۔

اس وقت سارا بازار گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا اور وہ جانتی تھی کہ کوئی اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکے گا۔ تھانے دار کے کمرے کا دروازہ تھانے کی مخالف سمت کھلتا تھا۔ اس نے ابھی وردی زیب تن کی ہی تھی جب کسی نے باہر سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

تھانے دار نے خود دروازہ کھولا تو سامنے چادر میں لپیٹی مختاراں بائی کھڑی تھی.....!

”خیریت بائی جی! صبح صبح آپ کدھر؟“

”بس میاں صاحب بہت مجبور ہو کر آئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بڑے لوگوں کو تکلیف دی جائے۔“ وہ اندر آ کر تھانے دار کے سامنے بچھی کر سی پر بیٹھ گئی۔

”بائی جی ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی تکلیف ہو تو ہماری نوکری کا کیا فائدہ۔ حکم کرو..... بات کیا ہے.....؟ مجھے بلا لیا ہوتا۔“

تھانے دار جانتا تھا کہ مختاراں بائی کا..... ”بڑے لوگوں“ کے ہاں آنا جانا لگا رہتا ہے اور اس سے پہلے والے تھانے دار کا تبادلہ بھی یہاں سے اسی لئے ہوا تھا کہ اس نے مختاراں بائی کو

کے گھرفون کر کے کسی سے دریافت کروایا تھا کہ ارسلان صاحب نے کب واپس آتا ہے، جواب میں دونوں مرتبہ فون سننے والے نے اسے ڈانٹ دیا تھا اور سختی سے کہا تھا کہ اس فون نمبر پر کوئی ارسلان صاحب نہیں رہتے۔ مجبور ہو کر وہ حالات پر نگہ کر کے بیٹھ رہی۔ اس درمیان باجے والا استاد فیض اسے شریفان کے ایک ایک پل کی رپورٹ لا کر دیتا رہا۔ جس جس کوٹھے پر جا کر شریفان نے اس کے خلاف زہرا لگایا تھا۔ وہاں کے ایک ایک پل کی خبر کوٹھے کے استادوں کے ذریعے استاد فیض تک پہنچتی جہاں سے وہ پھر مختاراں بائی کو منتقل ہو جاتی۔

شریفان کے پراپیگنڈے نے مختاراں کے کوٹھے کی رونق ختم کرادی تھی۔ یا تو یہ عالم تھا کہ نازنین کا ڈانس دیکھنے کو گاہکوں کے ٹھٹھے لگے رہتے تھے یا یہ حالت تھی کہ نوکر دوں کا خرچ بھی ڈھنگ سے نہیں چل رہا تھا۔ وہ رقم جو لیٹوراڈو وائس ارسلان کی طرف سے اسے ملی تھی۔ مختاراں نے اپنے محفوظ سرمائے میں منتقل کر لی تھی، لیکن اب یہ نوبت آنے والی تھی کہ وہ محفوظ سرمائے کی طرف ہاتھ بڑھاتی۔

آج تو غضب ہی ہو گیا جب رات دیر گئے تک کوئی گاہک کوٹھے کی سیڑھیاں نہ چڑھا تو استاد فیض نے افیم کے نشے سے اونگھتے ہوئے کہا۔

”بی بی! اب دکان بڑھانی لیں۔ بازار بند ہونے میں ایک گھنٹہ ہی تو رہ گیا ہے۔ اب کون اس طرف آئے گا..... یوں بھی ایسی خاندانی طوائف کا منہ خالی کوٹھا“ اچھی بات نہیں ہے..... بی بی! تم نے اس بازار میں رہنا ہے تو ذرا سیاست سے کام لیا کرو..... بیٹی کی طبیعت کی خرابی کے بہانے آج چھٹی ہی کر لیں..... ورنہ شریفان.....“

”نام نہ لو اس خانگی کا میرے سامنے۔“ اس نے استاد فیض کی بات کاٹتے ہوئے کہا..... ”اس جنم جلی کو ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ ساری زندگی یاد رکھے گی۔ زبان کاٹ کر ہاتھ میں نہ دے دی تو میرا نام بدل دینا..... کتیا کی اولاد اپنی اوقات بھول کر میرے منہ لگ رہی ہے.....!“ غصے سے اس کے گلے کی رگیں پھولنے لگی تھیں۔

”تم جاؤ کل آنا.....!“ اس نے استادوں کو چھٹی کا اشارہ کیا اور وہ چپ چاپ اٹھ گئے۔

رواگئی پر اس نے دونوں کو ”خرچ پانی“ دیا تھا۔ بہر حال وہ خاندانی طوائف تھیں۔

تھیں جن میں اسے کارروائی کرنا تھی۔ اس طرح کم از کم دو دن ان لوگوں کی ضمانت نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی روز بعد دوپہر مختاراں بائی اور نازنین سائیں سہیلی سرکار کے عرس میں شرکت کرنے دوسرے صوبے میں چلی گئیں۔ ایک نوکر وہ اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ اس طرح کچھ وقت بھی کٹ جاتا اور اس منحوس بازار سے نجات بھی مل جاتی۔

ان کی روانگی کے دو دن بعد اچانک پولیس نے شریفان کے کوٹھے پر چھاپہ مارا اور اس کی بیٹیوں بیٹیوں کو رنگے ہاتھوں تماش بینوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے گرفتار کر لیا۔ ماں بیٹیوں اور ان کے گاہکوں کو پولیس جس طرح سارے بازار میں ذلیل کرتی تھانے تک لائی تھی اسے دیکھ کر بڑے بڑوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

تین روز تک تھانے والے شریفان کی دھنائی کرتے رہے۔ جو کوئی سفارش کو جاتا گالیاں کھا کر واپس آتا۔ تین روز بعد شریفان مہینے بھر کی کمائی لٹا کر لڑکیوں سمیت کوٹھے پر پہنچی۔ اس نے ایسا سبق سیکھا تھا کہ اپنی آنے والی نسلوں کو نصیحت کر جاتی کہ آئندہ مختاراں بائی سے متھا نہ لگاتا۔

○

”پرسوں تم لندن جا رہے ہو..... ایک ہفتے کے لئے اگر تم چاہو گے تو تمہارے قیام میں تین چار روز مزید اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔“ نجمہ نے صبح ناشتے پر اسے خوشخبری سنا دی۔

”تھینک یو.....!“ ارسلان نے بے ساختہ کہا۔

واقعی وہ خوشی سے پھولے نہیں سارہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ نجمہ بیگم تصادیر کا کارنامہ انجام پانے پر اسے انعام دے رہی ہے۔

”اپنے لئے آج دو تین سوٹ پسند کر لینا۔ باقی شاپنگ لندن میں کرنا۔ وہاں بہت اچھے میزبانوں کا انتخاب کیا ہے میں نے تمہارے لئے۔“ نجمہ بیگم نے بے تکلفی سے آنکھ دہائی۔

”جی شکریہ.....!“ وہ اور کیا کہتا۔

اگلا سارا دن اس نے تیاری میں گزارا۔ اس درمیان نجمہ بیگم نے انٹرنیشنل سفر کے آداب سمجھا دیئے تھے اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ جس جہاز کے ذریعے وہ جا رہا ہے وہ فریٹ کرفٹ پر رک

بھی آنکھیں دکھانا شروع کر دی تھیں۔

”میاں جی! بات کچھ ایسی ہی ہے۔ میں خواہ مخواہ کسی کو تنگ کرنے کی قائل نہیں، لیکن جب پانی سر سے گزر جائے تو پھر کچھ کرنا ہی پڑتا ہے..... تم جانتے ہو ہم عزت دار لوگ ہیں۔ ہر ایرے غیرے کے منہ لگنا پسند نہیں کرتے۔ چھٹی گلی والی شریفان کو تو سارا تھانہ جانتا ہے۔ آج کل اس نے میرے خلاف کچھ زیادہ ہی زبان چلانا شروع کر دی ہے..... تم جانو میاں جی! اگر ہماری عزت پر حرف آ گیا تو کہاں منہ دکھانے کے لائق رہیں گے۔ وہ تو شکر کروا بھی ملک صاحب کے کانوں میں ایسی بات نہیں پہنچی ورنہ وہ کچھ زیادہ ہی سختی کرتے..... میں بھی اس کجبت کا برا نہیں چاہتی، لیکن ”چھنال“ نے کچھ زیادہ ہی بک بک شروع کر دی ہے۔ میں نے سوچا ایس پی صاحب کے پاس کیوں جاؤں جب اپنے میاں صاحب موجود ہیں۔“ اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

”تم حکم کرو بائی جی! اس کی ایسی تیسی۔ ایسا سبق سکھاؤں گا کہ تمہارے جوتوں کو چھو کر گزرے گی۔“ تھانے دار نے گردن پھلاتے ہوئے کہا۔

”بس میاں جی! ذرا بچ بچا کر۔ کسی کو کانوں کا خبر نہ ہو ورنہ سارا بازار میری جان کو آ جائے گا..... ماں بیٹیوں کو کم از کم ایک رات تھانے کے ملازموں کا مہمان ضرور رکھنا۔ بے فکر رہنا کوئی تمہارا بال بیک نہیں کر سکتا.....!“ کہتے ہوئے اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور چھوٹا سا بوٹ نکال کر اس میں سے تین بڑے بوٹ نکال لئے۔

”میاں جی! شریفان کو پتہ چل جانا چاہئے کہ اس کا واسطہ کس سے ہے۔“ اس نے بوٹ تھانے دار کی مٹھی میں تھماتے ہوئے کہا۔

”بائی جی! اس کی کیا ضرورت تھی۔ ہم تو تمہارے خادم ہیں۔ تم اطمینان سے جاؤ اور دیکھتی رہو کہ میں اسے کیسا سبق سکھاتا ہوں.....!“ اس نے بے شرمی سے ہنس کر بوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

○

مختاراں بائی جس طرح آئی تھی اسی طرح چادر لپیٹ کر واپس چلی گئی۔ تھانے دار نے اسے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔ مختاراں کو بھی اس کی بات پسند آئی تھی۔ دوسرے کاری چھٹیاں آ رہی

علاوہ اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں تھا۔

”لیکن یہ دس پندرہ دن گزاریں گے کیسے؟“

یہ سوچ اس کے لئے بڑی جان لیوا تھی۔ جب سے بازار والوں کو علم ہوا تھا کہ نازنین اب راتوں کو غائب بھی رہنے لگی ہے تو انہوں نے مختاراں بانی کے متعلق بڑی غلط رائے قائم کر لی تھی۔

”اے بی! وہ تو شروع ہی سے ”خاگئی“ تھی۔ میں نے اس کی جوانی دیکھی ہے۔ بس زیادہ منہ نہ کھلواؤ میرا۔ وہاں جالندھر میں کوئی اس کو منہ نہیں لگاتا تھا۔ یہاں آ کر بے چاری خاندانی کجبری بن گئی..... ارے آج سے کہاں یہ تو پچھلے ایک سال سے نازنین سے پیشہ کر داری ہے۔ جانے مولا! ہم تو کسی سے کہتے نہیں..... اس نے خاندانی لوگوں کا نام بدنام کر رکھا ہے۔“ شریقاں کے لئے تو بلی کے بھاگوں چھینکاؤں والی بات ہوئی تھی۔

اس نے بازار میں وہ ڈنڈی پٹی کہ جسے علم نہیں تھا وہ بھی جان گیا۔ اب مختاراں کے کوٹھے کی شہرت ایسی بگڑی تھی کہ کوئی ادھر منہ نہیں کرتا تھا۔

بلا کباڑیہ جو پچھلے دو سالوں سے اس کا مستقل گاہک تھا۔ نازنین کے اچانک کسی رات غائب ہو جانے پر بڑا غصہ کرنے لگا تھا۔ اس نے مختاراں سے اشارے کئے میں خود بھی کہا تھا۔ پھر ایک روز سارنگی نواز استاد گامی کہ جو جالندھر ہی سے مختاراں کے ساتھ لگا تھا، کہلویا کہ اگر وہ چاہے تو بلا منہ مانگا مہینہ دے کر نازنین کو بٹھانے کے لئے تیار ہے۔

لیکن.....!

مختاراں کا دماغ تو ساتویں آسمان پر تھا۔ ملک صاحب کے ہاں نازنین کے ایک دو مرتبہ چلے جانے اور تھانے میں اس کے دو تین فون آنے کے بعد اس نے یہ سمجھا تھا کہ جیسے اب وہ ہی بازار کی کوسلر بن گئی ہے۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ استاد گامی کو ڈانٹ دیا اور کہا تھا کہ اسے یہ بات کہتے ہوئے شرم نہ آئی۔

”بی بی پرانا نمک خوار ہوں۔ جو بات کروں گا تمہارے بھلے کی کروں گا۔ یہ چڑھتی جوانی اڑتی چڑیا کی طرح کسی روز اچانک ہی ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ اگر چچی نے ہاتھ پاؤں اچھے نکالے ہیں تو یہی دن ہیں اپنے برے دنوں کا سامان کر لو..... ورنہ کسی روز اس دن کو بہت پچھتاؤ

کر بہتھرو جائے گا۔ اس نے ارسلان کو بتایا تھا کہ ایئر پورٹ پر جب وہ اترے گا تو اسے کن کن مراحل سے گزرنا ہوگا۔

یہ بات اس نے بطور خاص اسے سمجھائی تھی کہ راستے میں جہاز جس ایئر پورٹ پر ٹھہرے وہاں اسے لاؤنج میں جانے کا موقع ملے تو اپنا ہینڈ بیگ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھے جس میں اس کا پاسپورٹ اور کرنسی ہوگی۔

پاکستان سے لندن روانگی تک کا وقت اس نے خواب کے عالم میں گزرا تھا۔ وہ جاگتے ہوئے بھی لندن کے سینے دیکھتا رہا۔ اس دوران ایک مرتبہ مختاراں بانی نے بے قرار ہو کر اپنا ایک آدمی اسے لینے کے لئے بھیجا تھا لیکن چونکہ اس کو ارسلان تک پہنچنے ہی نہ دیا۔ چونکہ ارکو نیگم صاحبہ کی طرف سے خصوصی حکم نامہ ملا تھا کہ ارسلان کے کسی ملاقاتی کو اگر وہ یہاں تک پہنچ ہی جائے تو ملنے کی اجازت نہیں..... سب کو یہی بتایا جائے کہ وہ چھٹی لے کر کہیں چلے گئے ہیں اور پندرہ روز کے بعد واپس آئیں گے۔

○

مختاراں بی بی کو جب یہ پیغام ملا تو وہ چکر اکر ہی رہ گئی۔ اسے تو اپنے بقایا جات کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ارسلان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلے روز شام کو ان سے ملے گا، لیکن وہ رات گئے تک نہ آیا تو مختاراں بانی نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر ایک میراثی کو اس کی طرف روانہ کر دیا تھا حالانکہ ارسلان نے اسے کبھی اپنا فون نمبر نہیں دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ خود اس سے ملنے نہ آئے۔

جب اسے یہ پیغام ملا کہ ارسلان تو دس پندرہ دن چھٹی چلا گیا ہے تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

”اللہ خیر کرے.....!“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

صبح تک وہ پریشانی کے مارے ایک بل نہ سو سکی۔ بالآخر اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ ملک صاحب سیاسی آدمی ہیں، عین ممکن ہے انہوں نے کسی ایئر جنسی کام سے اسے بھیج دیا ہو۔

اس کے لئے اب دس پندرہ دن تک بے قراری سے ارسلان کا انتظار کرتے رہنے کے

۱۱۔ سید اکبر نے ان کو بہت سے لکھے۔ لکھنے والا آیا تو قافیہ لایا اور
 وہ ابھی لکھتا تھا کہ ان کے ان غزلوں کے ساتھ ان کو بھیج دے
 کہ اہل قافیہ کے لیے لکھا گیا ہے۔ چنانچہ ان کو بھیج دیا اور
 یہ سب لکھا۔

[illegible]

کے ننھے ننھے قطروں کا احساس ہو رہا تھا۔ ہتھیلی سے اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور کھڑکی کے شیشے سے باہر دن دے پر نظریں جما کر بیٹھ رہا۔

نجمہ ملک نے اس سے بہت خطرناک کھیل کھیلا تھا۔

اگر اس بریف کیس میں ہیر و من موجود تھی تو اسے ارسلان کو ضرور بتانا چاہئے تھا۔

لیکن.....!

اس نے نہیں بتایا۔ ارسلان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟

”کیا نجمہ ملک نے یہ سمجھا تھا کہ میں اس کا کہنا نہیں مانوں گا.....!“

اگر نجمہ بیگم اس سے کوئی بھی کام کہتی تو وہ اس کام کے لئے کبھی انکار نہ کرتا۔ اس کے پاس نجمہ ملک سے سرتابی کی گنجائش نہیں تھی۔ اب وہ نجمہ کے ساتھ ایک گہرے راز میں شریک ہو چکا تھا۔ انہوں نے مل کر ملک صاحب کے خلاف سازش تیار کی تھی۔ اس سازش میں اس نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اگر ملک کو بھٹک بھی پڑ گئی تو وہ اس کی نکابوٹی کر ڈالے گا۔

وہ جانتا تھا ملک صاحب اپنے دشمن کو کتوں کے سامنے پھینک دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔

اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب یا جواز موجود نہیں تھا کہ آخر نجمہ ملک نے اس کے ساتھ یہ زیادتی کیوں کی؟

○

جہاز کے مائیک سے نشر ہوتی موسیقی ختم گئی اور ایک ایئر ہوسٹس قرآنی آیات کی تلاوت کے بعد جہاز کی روانگی کا اعلان کر رہی تھی۔ اعلان کے خاتمے کے ساتھ ہی جہاز کے انجنوں کی آواز بدلنے لگی تھی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ ریگنٹا شروع کر دیا اور دن دے پر ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد جب جہاز نے پرواز کے لئے اڑان بھری تو ارسلان کو قدرے سکون کا احساس ہوا۔

اب وہ اس لمحے کا منتظر تھا جب انہیں سیٹ بیلٹ کھولنے کی اجازت ملتی اور وہ کسی کام کے بہانے بریف کیس کھول کر اس کے اندر موجود چیزوں کا جائزہ لیتا۔ کیونکہ اس کے سامنے تو نجمہ بیگم نے اس میں دو تین فائلیں ہی رکھی تھیں اور اسے بتایا تھا کہ کوئی مسٹر مارٹن جو اسے

یہاں کسی نے اس کا سامان کھول کر دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی بلکہ اب تک دو تین مرتبہ مقامی عملہ ان سے ”کوئی خدمت“ دریافت کر چکا تھا۔

جہاز کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا جب اچانک ہی نجمہ بیگم کے حکم نے اسے چونکا دیا۔ ”جہاز فریئرٹ ایئر پورٹ پر رکے گا اور تمہیں ٹرانزٹ لاؤنج میں جانے کی اجازت ملے گی۔ جس ٹرمینل پر یہ پروازر کے گی؟ اس پر ایک ڈیوٹی فری شاپ موجود ہے۔ سب لوگ وہاں جائیں گے، تم بھی جاؤ گے..... وہاں ایک دوست تمہاری تصاویر کے ساتھ تمہارا منتظر ہوگا۔ وہ فون پر تمہاری بات بھی مجھ سے کروائیں گے۔ یہ بریف کیس اس دکان پر چھوڑ دینا۔ وہاں بعینہ ہی دوسرا بریف کیس تمہیں مل جائے گا۔ جاؤ شاباش! گڈ بائی! اپنا خیال رکھنا۔“

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ وہ چکر اکر ہی رہ گیا۔

مسافر قطار میں جہاز کی طرف آ رہے تھے اور نجمہ بیگم نے عین آخری لمحات میں اس پر پہاڑ گر دیا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ ارسلان کو کچھ کہنے سننے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ یہاں بریف کیس کھول کر دیکھ سکتا..... اگر اس میں کوئی خطرناک شے موجود ہے تو اسے باقی سارا بندوبست خود کرنا تھا۔

اب ارسلان کو یاد آ گیا کہ نجمہ بیگم کا بہاول خان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

○

دھڑکتے دل کے ساتھ وہ مسافروں کی قطار میں لگ گیا۔

فرسٹ کلاس کی قطار بہت مختصر تھی۔ اسے ایک شاندار اور آرام دہ کوچ نے بمشکل تین منٹ میں جہاز پر پہنچا دیا۔ جہاز کی اس اعلیٰ کلاس کے دروازے پر ایک نازک اندام ایئر ہوسٹس نے اپنے پورے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر کے اسے خوش آمدید کہا اور اس کے بورڈنگ کارڈ سے سیٹ کا نمبر پڑھ کر اس کو بڑے احترام سے متعلقہ سیٹ پر بٹھا دیا۔

اسے کھڑکی کی طرف سیٹ ملی تھی اور ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔

بار بار اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بریف کیس کو کھول کر دیکھے، لیکن ابھی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

جہاز کے ایئر کنڈیشن پوری رفتار سے چل رہے تھے، لیکن ارسلان کو اپنے ماتھے پر پسینے

چاپ بیٹھ کر کڑھتے رہو..... میرا مطلب سمجھ گئے نا۔“ سلیم نے بیسز کا خالی ٹن ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا۔

”ہاں سلیم صاحب! میں بہت اچھی طرح آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔“ اس نے کہا۔
”یہ بریف کیس لندن لے جاؤ۔ وہاں مارٹن کو سوئپ دینا۔ تم سے ضرور ملاقات ہو گی۔“

سلیم نے اسے ہو بہو اس جیسا بریف کیسے دیتے ہوئے کہا۔
”شکریہ!“

”تمہارا بھی شکریہ۔ اب تم چلو۔ جہاز روانگی کے لئے تیار ہے۔ خیال رہے کہ تم ایک معزز بزنس مین ہو۔ خود کو بزنس مین پوز کرو..... سفر بخیر۔“ اس نے اپنا ہاتھ ارسلان کی طرف بڑھایا اور اس سے گرجوشی سے مصافحہ کر کے دکان سے باہر نکل گیا۔

ارسلان والا بریف کیس اس نے خود سنبھال لیا تھا۔ ارسلان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جب وہ سلیم سے بریف کیس موصول کر رہا تھا تو کسی نے اس کی تین چار تصویریں بڑی پھرتی سے اتار لی تھیں۔

یہاں لوگ سفر کی یادگار تصویریں اتارنے میں مصروف تھے۔ ارسلان کو بالکل شک نہ گزرا کہ کوئی اس کی تصویر بھی اتار سکتا ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے واپس جہاز میں آیا تھا۔ ٹرانزٹ لاؤنج سے جہاز میں واپس جاتے ہوئے اس کا بریف کیس ایکسپریٹیشن سے گزارا گیا لیکن کسی نے اسے کھولنے کے لئے نہیں کہا۔

○

فرینکلنٹ سے لندن تک کا سفر تو بمشکل گھنٹے کا تھا، لیکن جہاز نے بیٹھو پر آدھ گھنٹہ تک چکر کاٹے جس کے بعد اسے یہاں اترنے کے لئے جگہ میسر آ سکی۔ غریب ممالک کی ایئر لائنوں کے ساتھ یہاں یہی سلوک کیا جاتا تھا۔

جہاز سے ایئرکیشن تک کا سفر اس نے بخیر و خوبی طے کر لیا۔ اس کے اندراجات اتنے مکمل اور مستحکم تھے کہ یہاں کسی نے اس سے زیادہ اگلے سیدھے سوالات دریافت نہیں کئے۔ کیونکہ ہر سوال کا جواب دینے کے لئے اس کے پاس پہلے سے دستاویزی ثبوت موجود تھے۔

سانس میں کتنے سوال پوچھ لئے۔

”جی نہیں شکریہ۔ بہت اچھا۔“ ارسلان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے اور کیسے کہے۔
”بھئی میں معافی چاہتی ہوں تمہیں عین آخری لمحات میں پریشان کیا۔ تم نے یقیناً اطمینان کر لیا ہوگا کہ خطرے والی کوئی بات نہیں تھی۔ تم اسے میری طرف سے مذاق ہی سمجھ لو۔ بھئی آخر ہم اچھے دوست ہیں۔ میں تم سے مذاق کا حق تو رکھتی ہوں ناں.....!“ مسز نجمہ ملک کا قہقہہ دوسری طرف سے گونجا اور ارسلان کے تپتے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

”تم سلیم صاحب کو جانتے ہو، لیکن یہ تمہارے لئے سلیم صاحب ہی ہیں۔ باقی سب کچھ بھول جاؤ۔ انہیں بریف کیس دے دو یا پھر جیسے وہ کہیں کر لو۔ بے فکر رہنا تمہیں کوئی منہ میں نہیں ڈالے گا۔ وہاں اگر تم نے اپنے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے تو وہ لوگ خواہ مخواہ پریشان کریں گے۔“ مسز ملک نے دو تین باتیں کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”نجمہ ملک آپ کی بہت تعریف کرتی ہے۔ بہت متاثر ہے آپ سے شاید!“ سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی! ان کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں کس قابل.....؟“ ارسلان مسکرایا۔

”مسٹر ارسلان یہ دنیا بہت بڑی لیکن بہت مختصر ہے۔ جانتے ہو کن کے لئے؟“

اس نے ارسلان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک دولٹے وقف کیا، پھر خود ہی کہا:
”ان کے لئے جو اسے مسخر کرنے کا عزم لے کر نکلیں۔ ورنہ تو مختصری زندگی بھی پہاڑ دکھائی دینے لگتی ہے۔ تم تو جوان ہو، بیخند ہو چاہو تو ساری دنیا کو اپنے قدموں تلے روند سکتے ہو..... شاید تمہیں میری بات سن کر حیرانی ہوگی کیونکہ تم میرے اصل روپ سے بھی آگاہ ہو۔ میرا ایمان ہے کہ جو مشکل زندگی میں آتی ہے وہ ٹل نہیں سکتی۔ موت کا ایک لمحہ مقرر ہے جیسے زندگی کا۔ پھر ڈر کس بات کا؟ یہ سب سیاست دان، دانشور، تاجر، لیڈر وغیرہ یہ سب لوگ آخر کیا کرتے ہیں؟ سب دنیا کو فتح کر لینا چاہتے ہیں۔ اپنے علم، اپنی دولت، اپنے ذہن اور اپنی قابلیت کے بل بوتے پر چھا جانا چاہتے ہیں..... مسٹر ارسلان یہ دنیا کمزوروں کے لئے تو بنی نہیں..... میری ماں کہا کرتی تھی: ”بیٹا! جو رات قبر میں آتی ہے وہ کبھی بستر پر نہیں گزر سکتی۔“ اگر تم نے کارزار زندگی میں قدم رکھ ہی دیا ہے تو پھر ”واریر“ بن جاؤ۔ ہر لمحے چوکس اور تمام ہتھیاروں سے مسلح۔ ورنہ ایک طرف چپ

اپنی طرف کھینچا۔ ”سروس“ کے دروازے سے باہر نکلتے ہی اس نے بے تکلفی سے مقامی روایات کے مطابق اپنا ہاتھ ارسلان کی کمر پر رکھ دیا۔ جب کہ ارسلان کا ہاتھ میکانیکی عمل کے تحت اس کے کندھے پر چلا گیا..... سروس کے دروازے سے پارنگ تک کا ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ ارسلان نے عالم مدھوشی میں طے کیا تھا۔

اس ماحول نے اس پر سحر طاری کر دیا تھا۔ ”لیوٹن“ تک کیرن نے اسے اتنا بے تکلف کر لیا کہ جب وہ مطلوبہ مقام پر پہنچے جہاں مسٹر مارٹن اس کا منتظر تھا تو وہ آپس میں خاصے ”فری“ ہو چکے تھے..... کار سے اترنے کے بعد ارسلان نے خود آگے بڑھ کر کیرن سے لپٹتے ہوئے ”مقامی انداز“ میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

○

لیوٹن کی اس خوبصورت بستی کے گرم اور آرام دہ مکان میں اس کا استقبال مسٹر مارٹن نام کے ایک ذہلی عمر کے انگریز نے کیا جس کی کپٹیوں سے سفید بال جھانک رہے تھے لیکن اس کی جسمانی ساخت اور قد کاٹھ دیکھ کر ارسلان کو اپنی جوانی حقیر دکھائی دے رہی تھی۔

مارٹن نے اپنے بال کالے کرنے کی فکر نہیں کی تھی، لیکن اس کو دیکھ کر کوئی بھی اس کی جاذب نظر شخصیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بھی ارسلان سے وہی کچھ کہا جو کیرن نے بیٹھرو ایئر پورٹ پر دریافت کیا تھا۔

کیرن کی معیت میں اب دونوں ایک آرام دہ بیڈروم میں آگئے جہاں اس نے قیام کرنا تھا۔ اس کمرے میں ٹی وی، ریڈیو، ویڈیو اور ٹیلی فون سمیت دنیا کی ہر آسائش موجود تھی۔ کمرے سے ملحقہ ہاتھ روم کی طرف کیرن نے راہنمائی کر دی تھی اور کمرے کی الماری میں اس کے لئے سلیپنگ سوٹ موجود تھا۔

”تم آرام کرو۔ سفر خاصا تھکا دینے والا تھا۔ رات کو کھانے پر ملاقات ہوگی۔ میں تمہارے دوست کو لینے جا رہا ہوں۔ کیرن تمہاری میزبانی کرے گی۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو اسے بے تکلف بتا دینا۔ یہاں انڈین مسلمانوں کے ہوٹل اور دکانیں موجود ہیں۔ سب کچھ مل سکتا ہے۔“ مارٹن یہ کہہ کر چلا گیا۔

ارسلان اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ آخر اس کا کون سا ”دوست“ ہے جسے وہ لینے جا

”شاید سردی محسوس ہو رہی ہے۔ اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی سردی پڑی ہے۔ لندن میں اپریل میں موسم عموماً اچھا ہوتا ہے۔“ کیرن نے یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ بے تکلفی سے تھام لیا تھا۔ ارسلان کو جھکسا سا لگا، لیکن وہ سنہل گیا۔

”واقعی میری توقعی جم گئی۔“ اس نے کیرن سے کہا۔

دونوں ”سروس“ میں چلے آئے جہاں ہاتھ روم تک کیرن نے اس کی راہنمائی کی تھی۔ اب دونوں ایک میز پر آئے سانسے بیٹھے تھے۔ اندر ماحول خاصا گرم تھا..... ارسلان نے اندازہ لگایا کہ یہاں سردی صرف سڑکوں پر ہوتی ہے یا پھر کھلی فضا میں۔ باقی تو ہر جگہ ٹھہریچر نارمل رکھا جاتا ہے۔

کیرن اس کی چوائس دریافت کر کے اسے وہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔ یہاں ”سیلف سروس“ تھی جس کا علم ارسلان کو نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ٹرے ہاتھوں میں پکڑے وہاں آگئی۔ ایک ٹرے اس نے اپنے اور دوسری ارسلان کے سامنے رکھ دی۔ یہاں کے ماحول اور لوگوں کی طرح چیزوں کا ذائقہ بھی اس کے لئے اجنبی تھا۔

ہر شے نفاست کا شاہکار تھی، لیکن فی الوقت اس سمجھنے کے لئے بد مزہ! جیسے تیسے اس نے اہلی ہوئی سبزیاں حلق سے اتاریں اور فوم کے کپ میں پڑی کافی کو گھونٹ گھونٹ کر کے پی لیا۔

کیرن کو اپنے مہمان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ بات اس کے فرائض میں شامل تھی کہ وہ مہمان کی ہر ممکن دلجوئی کرے۔ اس کا ”باس“ اسے تنخواہ اس بات کی دیتا تھا کہ وہ اپنے مہمانوں کے لئے وہ سب کچھ کر گزرے جس کا ارسلان کے ملک میں تصور بھی نہیں کیا جاتا۔

کیرن نے آہستہ آہستہ اسے بے تکلف کر لیا تھا۔ وہ ارسلان سے سفر اس کے ملک اور وہاں کے لوگوں کی باتیں کرتی رہی۔ پھر اس نے یہاں کی باتیں شروع کر دیں۔ اس دوران اس نے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارسلان کو ذہنی طور پر خاصا نارمل کر دیا تھا۔

ان کے نزدیک بیٹھے لوگ ایک دوسرے سے چپکے ماحول سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھے۔

کیرن اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے دوبارہ ہنستے ہوئے ارسلان کا ہاتھ پکڑ کر اسے قریباً

جہاز ہمارے سر پر آگرے اور ہم سب مرجائیں۔“

بہاول خان کا بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ بات ارسلان کو اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اس تھوڑے عرصے میں مغربی زندگی کے ایسے ایسے کمالات کا نظارہ کر لیا تھا کہ اب اس کا دل ”ٹان“ کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اس بات میں کوئی شک بھی نہیں کہ وہاں اپنے ملک میں بھی اس کی زندگی اتنی ہی غیر محفوظ تھی جتنی آج یہاں ہے۔ وہاں بھی جانے کس لمحے کسی سمت سے اندھی گولی آئے اور اس کے سانسوں کا تانا بانا بکھیر کر رکھ دے۔

”میں یہاں اپنا اکاؤنٹ کھولنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے بہاول خان سے کہا۔

”ویل ڈن.....! سمجھنا آدمی ہو۔ آگے نکلو گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ارسلان کی پیٹھ تھپک دی۔

کیرن نے دو تین مرتبہ جوس تیار کر کے ان کے سامنے رکھا تھا اور اب وہ اگلے حکم کی منتظر کھڑی تھی۔

”یہاں راتیں دن کی طرح جاگتی ہیں۔ جاؤ اور زندگی کے مزے لوٹو۔ اب شاید ہماری ملاقات دیر بعد ہو یا بہت جلدی، لیکن ایک بات اپنے ذہن سے کبھی نہ اتارنا کہ ہم دونوں آپس میں کبھی نہیں ملے۔ اگر کبھی اپنے ملک کی کسی محفل میں ہمارا آنا سامنا ہو جائے تو ہم دونوں اتنے ہی اجنبی ہوں گے جتنے اب سے چند روز پہلے تک..... جتنے دن چاہو موج میلہ کرو۔ اس کے بعد کیرن تمہاری میزبان ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔ تمہارا اکاؤنٹ بھی کیرن صبح کھلوا دے گی۔ برطانیہ کے خوبصورت علاقوں کی سیر کرو۔ یہاں کے سسٹم کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ خدا حافظ۔“ اس نے اچانک کھڑے ہو کر اس سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور اس کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

مارٹن اس کے تعاقب میں ارسلان سے ہاتھ ملا کر دوبارہ ملاقات کی خواہش کر کے باہر نکلا اور پھر دونوں کار میں بیٹھ کر نامعلوم منزل کی طرف چل دیئے۔

کیرن اسے دوسری کار میں باہر لے آئی.....!

ہو۔ اس محنت کا انعام تمہیں دولاکھ کی صورت میں ملے گا۔ تمہارے دیگر تمام اخراجات بھی ہمارے ذمے رہے۔ یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم روپیہ کس کرنسی میں اور کہاں لینا چاہتے ہو۔ اگر یہاں اکاؤنٹ کھولنے کا ارادہ ہے تو یہاں لے لو۔ اگر پاکستان میں کسی جگہ چاہئیں تو وہاں مل جائیں گے۔“

”لیکن میں نے کوئی پھیرا.....“ ارسلان طلسم ہو شر با میں پھنس گیا تھا۔

”اپنا بیک لے آؤ۔“ بہاول خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارسلان کسی سحر زدہ معمول کی طرح اٹھا اور کمرے سے اپنا بیک لے آیا۔

”اسے کھول کر اچھی طرح دیکھو۔ اس میں کیا ہے؟“ بہاول خان نے کہا۔

”کچھ نہیں! میں نے خود چیکنگ کی تھی۔“ ارسلان بولا۔

”پھر بھی احتیاطاً دوبارہ دیکھ لو۔“

دوبارہ اس نے سارے کپڑے نکال کر دیکھے۔ اندر اور کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی خفیہ

جیب نظر آ رہی تھی۔ ارسلان حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”مسٹر مارٹن!“ بہاول خان نے مارٹن کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا جو ارسلان کی حالت

سے مسکراتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

○

مارٹن نے میز پر پھلوں کے نزدیک رکھا چاقو اٹھایا اور بیک کو نچلے حصے سے کاٹنا شروع کیا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سفید رنگ کی دس تھیلیاں موجود تھیں۔ ارسلان حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسے لاعلم رکھ کر استعمال کیا گیا تھا۔ اس صورت حال نے اسے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا، لیکن یہاں وہ منفی جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

”میں اصل میں تمہیں یہی سمجھانا چاہتا تھا کہ تدبیر اور تقدیر دونوں مل جائیں تو بہت سے لائیکل مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اب تم خود کتنے مراحل سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہو، لیکن تمہارا مال محفوظ رہا۔ اس کی وجہ جانتے ہو کیا تھی؟ مسٹر ارسلان انسان تجربے سے سیکھتا ہے۔ اگر اس دھندے سے لگے رہو گے تو تمہیں خود بہت سی باتوں کا علم ہو جائے گا۔ جہاں تک خطرے والی بات کا تعلق ہے تو تم جانو کہ خطرات کب زندگی کا حصہ نہیں رہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ابھی کوئی

رات ایک پہر بیت رہی تھی جب وہ کیرن کے وجود کا حصہ بنا گھر تک پہنچا۔ اب اسے کیرن سے کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کیرن بھی اب اس کے نزدیک عارفہ اور نازنین جیسی ہی کوئی لڑکی بن چکی تھی۔ ایسی درجنوں لڑکیوں سے اس کا سابقہ زندگی میں رہتا تھا۔

اس نے جان لیا تھا کہ عورت خواہ اس کا تعلق کسی بھی رنگ و نسل اور ملک و قبیلے سے ہو مرد کے لئے بلا آخر عورت بن کر رہ جاتی ہے اور وہ اپنے حسب نسب کی پہچان سے نہیں بلکہ اپنے جسم کی پہچان سے جانی جاتی ہے۔

رات دونوں نے ایک ہی خواب گاہ میں بسر کی۔ مغربی اطوار میں ڈھلی کیرن نے اسے سرور و نشاط کے ایسے ان دیکھے جہاں کی سیر کروائی کہ وہ دنگ رہ گیا۔

یہ سب اس کے لئے نیا لیکن زندگی کا سب سے خوبصورت تجربہ تھا۔ کیرن اس کی نس نس میں نشے کی طرح اتر گئی تھی۔

صبح دیر گئے تک دونوں اپنی جسمانی حالت سے بے نیاز مدھوشی کی نیند سوتے رہے۔ شاید ان لوگوں کی صبح کا آغاز ہی دو پہر سے ہوتا تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو کیرن اپنے جسم سے تولیہ باندھے ہاتھ روم سے باہر آ رہی تھی۔ ارسلان کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چمک گئی۔

صبح بخیر کہتے ہوئے اس نے رات خدمت میں کوئی کمی رہنے پر معافی مانگی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

ارسلان جب نہا کر باہر نکلا تو وہ ہونٹوں سے سگریٹ لگائے چائے سمیت اس کی منتظر تھی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ ناشتہ کیرن نے مشرقی انداز میں بنایا تھا۔ اس نے ناشتے کی میز پر ہی ارسلان سے اس کی اپنی مرضی کی کوئی جگہ دیکھنے کے متعلق پوچھا۔ ارسلان کے لئے فی الوقت کیرن کے وجود سے زیادہ اور کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے جب جواب دیا تو کیرن بے ساختہ تہقہہ لگا کر ہنس دی۔

”اگر مجھے ہی دیکھتے رہے تو بور ہو جاؤ گے۔ پھر میں کہاں بھاگی جا رہی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ٹیلی فون پر ہی دو تین جگہ نمبر گھما کر کچھ ریزرویشن کروائی اور تھوڑی دیر بعد وہ کار پر

گھر کی چابیاں اس کے پاس تھیں اور وہ ارسلان کو ”لندن“ دکھانے لے جا رہی تھی۔ شاید اس کی تنخواہ ہی میزبانوں کا دل بہلانے کی ملتی تھی۔ کار اس نے ایک ”پب“ (شراب خانہ) کے سامنے روکی اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔

نشے میں مدھوش عورتیں اور مرد دنیا و مافیہا سے بے نیاز شغل سے نوشی میں مصروف تھے۔ کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یہاں مختلف قسم کی شرابوں کا سمندر بہہ رہا تھا۔ ارسلان کے کہنے پر کیرن نے ہی اس کے لئے جام منتخب کیا اور صرف ایک ایک جام اپنے حلق میں اٹاٹیل کر وہ باہر چلے آئے۔

شراب خانے سے ایک انڈین ریستورنٹ تک کیرن نے اس کے ساتھ چپک کر سفر کیا تھا۔ وہ جتنی ہوشیار سے کار چلا رہی تھی اس سے زیادہ ہوشیاری سے اپنے سوار کو بھی کنٹرول کر رہی تھی۔ اس نے فی الوقت اعتدال کی پالیسی اپنائی ہوئی تھی اور ارسلان اپنے ہوش و حواس میں اس کا ہم سفر تھا۔

انڈین ہوٹل پر انہوں نے کھانا کھایا اور اب وہ ارسلان کو ایک ”ڈسکو“ کی طرف اڑائے لئے جا رہی تھی۔

آج ویک اینڈ تھا اور ڈسکو میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہال کمرے میں گھستے ہی شراب اور سگریٹوں کے دھوئیں نے ان کا استقبال کیا۔ ارسلان کے دل کی دھڑکن اس ماحول میں تیز ہونے لگی تھی۔

”واقعی دنیا یہی ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

یہی تھی وہ دنیا جو نجمہ ملک اسے دکھا کر پھنسانا چاہتی تھی اور وہ اس دنیا کی دلدل میں گہرا اترتا چلا جا رہا تھا۔

ارسلان یہ بھول چکا تھا کہ عشق و محبت کے اس طلسم ہوشربا کو آنے والے راستے تو بے شمار ہیں واپس جانے کا دروازہ کسی پر نہیں کھلتا۔

لیکن.....!

اس نے واپسی کے متعلق سوچا ہی کب تھا؟

وہ تو اس عالم رنگ و بو میں آگے اور آگے..... بہت آگے نکل جانا چاہتا تھا۔

لندن جا رہے تھے۔

ایک ہفتے میں اس نے ارسلان کو ایسے ایسے جہانوں کی سیر کروائی کہ اب رہ رہ کر اس کے دل میں یہاں بس جانے کی خواہش مچنے لگی۔ اس کا بینک اکاؤنٹ لندن میں کھل گیا تھا۔ قریباً ہر روز اس کی فون پر نجمہ ملک سے بات ہوتی تھی جو اس کے جذبہ شیطانیت کو مزید مہمیز لگاتی رہتی تھی۔

اس نے ارسلان کے اندر موجود تمام بشری کمزوریوں کو اس ڈھنگ سے ایکسپلاٹ کیا تھا کہ ارسلان جکڑا جا چکا تھا۔ ہر نئی فون کال پر وہ اس کے ضمیر کے گرد ہوس کی ایک مضبوط گرہ لگاتی چلی جا رہی تھی۔



اردو فینز ڈاٹ کام